دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۵ ماہ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۰ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

مشہور سائنس داں اور مسلم یونیورسٹی کے ہر دل عزیز استاذ پروفیسر اسرار احمد ۱۲/اپریل کو ایک طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔ تدفین اگلے دن یونیورسٹی قبرستان میں ہوئی۔ اس طرح حیات مستعار کا جو سفر ۱۹/دسمبر ۱۹۴۰ء کو اعظم گڈھ کے ایک گاؤں مہوارہ کلاں سے شروع ہوا تھا اپنے اختتام کو پہنچا۔ ان کے انتقال سے ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں سائنس کے میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ اسرار صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں پائی، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ پاس کی بستی پشپ نگر سے کیا۔ ۱۹۵۹ء میں شبلی نیشنل کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا اور گورکھپور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس طرح ان کے مستقبل کی عظمت کی اساس یہیں پڑی۔ انہیں اس کالج سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال بحیثیت لکچرر ان کا تقرر ہو گیا اور زندگی کا بڑا حصہ مادر علمی کی خدمت میں گذرا۔ ۱۹۸۴ء میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ملک اور بیرون ملک کئی باوقار سائنسی تحقیقی اداروں کے ممبر رہے۔ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں بار بار بیرون ملک کا سفر کیا اور سائنس کے اعلیٰ تحقیقاتی مراکز میں کام کیا۔ مرکز فروغ سائنس کے بانی ڈائرکٹر اور تہذیب الاخلاق کے مدیر رہے۔ ۱۹۹۸ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ لے کر کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ منتقل ہو گئے تھے۔ جب تک صحت نے اجازت دی اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں اور وہاں سائنس کی اساس پختہ کرنے میں مصروف رہے۔

اسرار صاحب کے مطالعہ وتحقیق کا موضوع Theoretical Nuclear Physics تھا۔ Quantum Scattering Theory کے میدان میں ان کی تحقیقات اساسی اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں جن مسلم اسکالرز نے سائنس کے میدان میں امتیاز حاصل کیا ان میں اسرار صاحب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ عالمی سطح پر ان کی تحقیقات کا اعتراف کیا گیا۔ ان کے علمی اکتسابات نے مادر علمی کے وقار کو بلند کیا۔ ریسرچ سے ان کی شیفتگی اس حد تک پہنچ چکی تھی جہاں ایک دانش جو کو نہ تو اپنی بیماری اور بے آرامی کا خیال رہتا ہے اور نہ دوسرے مسائل کا۔ درد کُش دوا سے وقتی آرام مل جاتا اور وہ پھر ایک نشاط تازہ کے ساتھ کام میں لگ جاتے۔ اس کے دردناک اثرات وعواقب کا ادراک ہوا تو تلافی کا وقت گذر چکا تھا۔

ان کے مرتبہ کے ایک سائنس داں کی ترجیحات اس کے اپنے موضوع اختصاص اور اپنی

تحقیقات تک محدود ہوتی ہیں۔ لیکن ہر اصول کے کچھ مستثنیات ہوتے ہیں اور اسرار صاحب ان ہی مستثنیات میں شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی میں سائنس کی اہمیت اور اولیت کے ساتھ ساتھ ملت اور معاشرہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور بھی تھا۔ مسلمانان ہند کی زبوں حالی کے گہرے تجزیہ سے ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کے درمیان سائنس کی تعلیم عام نہیں ہوگی اور مسلم معاشرہ میں سائنسی مزاج نہیں پیدا ہوگا اس وقت تک ان کے حالات میں کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہوسکتا۔ مسلمان بچوں کی بڑی اکثریت ابھی مدارس میں تعلیم پاتی ہے۔ اگر مدارس میں سائنسی مضامین نصاب تعلیم کا حصہ بن جائیں اور اس ذمہ داری سے بحسن وخوبی عہدہ برا ہونے کے لیے مدارس کے اساتذہ کی ضروری حد تک تربیت کی جاسکے تو ملت کے اندر سائنس کی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جاسکتا ہے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ان کی کوششوں سے ۱۹۸۵ء میں یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس (Centre for Promotion of Science) کی داغ بیل پڑی اور وہ اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۱ء تک انہوں نے یہ ذمہ داری جس طرح سنبھالی اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو غیر معمولی مساعی کیں اور مدارس پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کو شامل کرنے کی تحریک جس کی صداء بازگشت اب ہر طرف سنائی دیتی ہے اور اب ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے اس کا آوازہ پہلے پہل ان ہی نے بلند کیا۔ دور حاضر میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی توسیع واشاعت کی یہ ایک بڑی نمایاں اور اہم کوشش تھی۔

سرسیدؒ نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے، جس کے بغیر ان کی ترقی کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا، ایک رسالہ کے اجراء کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس مقصد سے انہوں نے انگلینڈ سے واپسی کے فوراً بعد اور کالج کی تاسیس سے کئی سال پہلے ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت شروع کی۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی توسیع واشاعت اور اس کے حق میں رائے عامہ کی تشکیل اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں تہذیب الاخلاق نے جو کلیدی کردار ادا کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ اس رسالہ کے بند ہونے کے ایک صدی بعد جناب سید حامد کی مساعی سے سرسید کی اس تاریخی یادگار کی ۱۹۸۱ء میں پھر اشاعت شروع ہوئی۔ اسرار صاحب کی متنوع اور گوناگوں صلاحیتوں اور مسلم معاشرہ کی اصلاح کے تئیں ان کی گہری دلچسپی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور کئی سال تک بحسن وخوبی اسے نبھایا۔ ان کے اداریے ملی مسائل کے سلسلہ میں ان کی گہری سوچ اور فکرمندی کے غماز ہوتے تھے۔ ان کی

شستہ اردو تحریروں کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ تھیوریٹکل نیوکلیر سائنٹسٹ کے قلم سے نکلی ہیں۔ انتظامی سطح پر اس رسالہ کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے باب میں انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اسرار صاحب کی شخصیت کی کئی جہات تھیں اور ان کی علمی دلچسپیاں متنوع اور گوناگوں تھیں۔ چونکہ دیانت داری اور اخلاص ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں شامل تھے اس لیے انہوں نے جو کام بھی کیا پوری طرح اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے، البتہ اس ضمن میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر ان کو ان کے موضوع اختصاص سے یکسر الگ ذمہ داریاں نہ سونپی گئی ہوتیں جن کی انجام دہی میں ان کو اپنی صلاحیت اور وقت کا معتد بہ حصہ صرف کرنا پڑا اور اس کے نتیجہ میں ان کو وہ یکسوئی اور دل جمعی بھی حاصل نہ رہی جو نظریاتی سائنس جیسے موضوع پر ریسرچ کے لیے ناگزیر تھی، تو انہوں نے اپنے موضوع پر اور بھی بہت کچھ گراں قدر تحقیقات یادگار چھوڑی ہوتیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ کام کرنے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر کام وہی کریں۔ اس کے نتیجہ میں وقت اور صلاحیت کا جو ضیاع ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اپنے علمی اور تحقیقی کمالات اور اکتسابات سے قطع نظر اسرار صاحب ایک نہایت شریف النفس انسان تھے۔ شرافت، مروت اور وضع داری ان کی شخصیت کے امتیازی پہلو تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے لیکن دشمن کسی کے بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے ان کو تکلیف پہنچتی تھی ان کے ساتھ بھی وہ ہمیشہ اچھائی کا معاملہ کرتے تھے۔ ان سے فیض تو بہتوں کو پہنچا لیکن دانستہ انہوں نے نقصان شاید کسی کو بھی نہ پہنچایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قوت برداشت عطا کی تھی۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بڑی فراخ دلی سے سنتے اور اس کو مناسب وزن دیتے۔ بڑے ہر دل عزیز استاد تھے۔ طلبہ سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے اور ان کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ طلبہ ان کی شاگردی کو قابل فخر تصور کرتے تھے۔ قحط الرجال کے اس دور میں ایک ایسی شخصیت کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے۔

ذاتی طور پر میرے لیے ان کی رحلت ایک بڑا سانحہ ہے۔ پانچ دہوں پر محیط عرصہ میں زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ ویسے ہی حاصل رہی۔ شبلی کالج کے اس مایہ ناز فرزند کو شبلی کی علمی یادگار دارالمصنّفین سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ ان دونوں اداروں سے تعلق خاطر کے باعث وہ مشہور سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کو، جن سے ان کے گہرے مراسم تھے، اعظم گڈھ لے گئے تاکہ مسلمانان ہند کے ان دو بڑے اداروں کو دیکھ سکیں۔ آخری دنوں میں بیماری کی شدید تکلیف کے باوجود انہوں نے دارالمصنّفین کو یاد رکھا اور اس کی مدد کے لیے کچھ عملی اقدامات بھی کیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان

کی کمیوں سے درگذر فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

مقالات

تعقید — ایک ادبی اصطلاح

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

''تعقید'' ایک ادبی اصطلاح ہے۔ اس کا ذکر بلاغت، لغت اور شعر وسخن کی کتابوں میں آتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ مصحفی (ف ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء۔۱۸۲۵ء) ایک قصیدے میں حریفوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تعقید سے واقف، نہ تنافر سے ہیں آگاہ　　نہ حرف یہی قافیے کے ورد زباں ہیں

(کلیات مصحفی ۹/ ۳۶)

انیسؔ (۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) اپنے ایک مرثیے کے چہرے میں کہتے ہیں:

جد و آبا کے سوا غیر کی تقلید نہ ہو　　لفظ مغلق نہ ہوں، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو

(روح انیس، ص ۲۰۲)

نور الحسن نیر کاکوروی (ف ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) نے ''نور اللغات'' میں مسرور کا شعر نقل کیا ہے:

تعقید کلام میں جہاں ہوتی ہے　　سامع کی طبیعت پہ گراں ہوتی ہے

(ص ۹۶۷)

اکبر الہ آبادی (ف ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے غزل کے ایک شعر میں اسے نہایت لطیف انداز میں باندھا ہے:

قد موزوں دیکھیے، جوڑے کی بندش دیکھیے　　کس قیامت کا ہے مصرع اور کیا تعقید ہے

(کلیات اکبر ۲/ ۳۰۹)

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

فن بلاغت اور لغت کی متعدد کتابوں کے علاوہ ظہیر احسن شوق نیموی (ف ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) کے رسالہ ''اصلاح'' (تصنیف مابعد ۱۳۰۰ھ/ ۸۳۔ ۱۸۸۲ء) میں بھی یہ اصطلاح زیر بحث آئی ہے۔لیکن آگے بڑھنے سے پہلے جناب شوق نیموی کا مختصر تعارف ضروری ہے۔شوق مضافات عظیم آباد کے باشندے، تسلیم لکھنوی (ف ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء) کے شاگرد اور حسرت موہانی کے استاد بھائی تھے۔ابتدا میں انہیں شعروسخن سے بہت دلچسپی تھی۔پھر ایک خواب کے نتیجے میں علوم دینیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فقہ وحدیث میں رتبۂ کمال کو پہنچے۔ان علوم میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (ف ۱۳۰۴ھ) سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔چنانچہ استاد کی علمی تحقیقات کا رنگ ان کی عربی تصانیف میں بھی نمایاں ہے۔''آثار السنن'' ان کی سب سے بلند پایہ تصنیف ہے۔

شوق کے اس مختصر تعارف کے بعد راقم عرض کرتا ہے کہ شعروسخن سے شیفتگی اور فقہ و حدیث میں بلند پایگی کے باوجود ''تعقید'' کی تعریف میں شوقؔ سے چوک ہوگئی۔اس کے بعد جب حسرت موہانی (ف ۱۹۵۱ء) نے ''معائب سخن'' (دیباچہ ۱۹۲۵ء) لکھی تو استاد بھائی کی جلالت شان پر اعتماد کرتے ہوئے کسی تحقیق وتفتیش کے بغیر ''تعقید'' سے متعلق شوقؔ کا بیان اپنی کتاب میں نقل کر دیا۔اس طرح یہ غلط تعریف مزید مستحکم ہوگئی۔اس کے بعد جناب شمس الرحمان فاروقی نے ''عروض، آہنگ اور بیان'' (طبع اول ۱۹۷۷ء) میں جب ''معائب سخن'' کا تنقیدی محاکمہ کیا تو انہوں نے بھی اپنی تمام بحث وتمحیص کی بنیاد اسی غلط تعریف پر رکھی اور نتیجہ بحث میں ''تعقید'' کو عیب کے بجائے ہنر قرار دیا۔اس پورے عرصے میں کسی نے شوق، حسرت یا فاروقی پر کوئی استدراک بھی نہیں لکھا۔چنانچہ فاروقی صاحب نے اپنی تازہ تصنیف ''لغات روز مرہ'' (دہلی وکراچی ۲۰۰۳ء) میں ''تعقید'' کے اندراج کے تحت اپنے سابقہ خیالات کا اعادہ فرمایا۔

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح تعقید سے متعلق قدرے تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔شوق نیموی رسالہ ''اصلاح'' میں ''تعقید لفظی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اگر لفظ اپنی اصلی جگہ پر نہ ہو، اس کو ''تعقید لفظی'' کہتے ہیں۔اردو

میں فاعل کو فعل و مفعول سے پہلے اور فعل کو سب سے آخر لانا چاہیے۔ جیسے ''تم نظر اٹھاؤ'' اگر اسے یوں کہیں کہ: تم اٹھاؤ نظر، یا اٹھاؤ نظر تم، یا نظر تم اٹھاؤ ''تعقید'' ہو جائے گی۔

اور مضاف الیہ کو مضاف سے مقدم و متصل ہونا چاہیے جیسے ''میر کا دیوان'' اگر یوں کہیں: دیوان میر کا ''تعقید'' ہو جائے گی۔

البتہ بعض مضاف ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیشہ تقدیم ہی چاہتے ہیں، جیسے ''بے تمہارے'' اور جب موصوف یا صفت ہندی لفظ ہو تو صفت مقدم لانا چاہیے۔ جیسے ''اچھے قلم''، ''خوش نما لوحین''۔(؟)

لیکن نظم میں اگر پورے پورے طور پر اس کا برتاؤ کیا جاتا تو شعر کہنا دشوار ہو جاتا۔ اس سبب سے اکثر جگہ تعقید لفظی معیوب نہیں ٹھہرائی گئی۔ البتہ جب لفظوں کے الٹ پھیر سے ترکیب درست ہو جائے اور نظم میں کچھ خلل نہ ہو تو بے شک معیوب ہے۔ جیسے:

ع جب نکلتے ہیں سینے سے نالے

ع جوانی کسی کی، لڑکپن کسی کا

ع ہمارا دل ہے وارفتہ، محبت میں حسینوں کی

ع بندے اچھے اچھے اب اس شوخ پر مرنے لگے

ان سب مصرعوں کو اس طرح نظم کرنا چاہیے:

ع نالے سینے سے جب نکلتے ہیں

ع کسی کی جوانی، کسی کا لڑکپن

ع ہمارا دل ہے وارفتہ حسینوں کی محبت کا

ع اچھے اچھے بندے اب اس شوخ پر مرنے لگے

ہاں اگر انقلاب سے کوئی دوسری خرابی پیدا ہو، جیسے:

ع کون آتا ہے سیر گلشن کو

کو اگر یوں کہیں:

ع سیر گلشن کو کون آتا ہے

تو "کوکون" کے اجتماع سے مصرع میں ثقل آجائے گا، یا جیسے "دامن کسی کا مدفن کسی کا" میں

ع جوانی کسی کی، لڑکپن کسی کا

ایسی صورتوں میں تعقید معیوب نہ ٹھہرے گی۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب فعل یا مفعول کی تخصیص وغیرہ مراد ہوتی ہے تو اس وقت ان کو فاعل پر مقدم کر لیتے ہیں جیسے "یہ کہتا ہے کون کہ تم نے خطا کی؟"۔ اسی طرح جب مضاف الیہ کی تخصیص وغیرہ کی جاتی ہے تو اس وقت مضاف الیہ و مضاف میں اتصال باقی نہیں رہتا۔ جیسے "ناسخ ہی کا دیوان ہے"، "آتش کی بھی غزل ہے اور یہ بھی سمجھ رکھو کہ فعل کے وہ علامات جو استمرار وغیرہ پر دلالت کرتے ہیں اگر اپنے محل پر نہ ہوں تو بہت بری تعقید ہے، جیسے "سنا تھا" کی جگہ "تھا سنا"، "چلے گئے تھے" کی جگہ "گئے تھے چلے"۔ (ص ۴-۵)

راقم عرض کرتا ہے کہ شوق نے "تعقید لفظی کی جو تعریف لکھی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اسی طرح نثر و نظم کی جس قدر مثالیں تعقید کے حوالے سے نقل کی ہیں یا اس تعریف پر جو دوسری تفریعات کی ہیں، ان کا بھی تعقید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ تعقید دراصل علم بلاغت کی اصطلاح ہے اور اس کا ذکر "فصاحت کلام" کی بحث میں آتا ہے۔ چنانچہ علمائے بلاغت کے نزدیک کلام کی فصاحت یہ ہے کہ وہ تین عیوب سے پاک ہو:

۱- تنافر کلمات سے۔ ۲- ضعف تالیف سے۔ ۳- تعقید سے۔

پھر تعقید کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ کلام میں گرہ پڑ جائے یعنی ایسی پیچیدگی ہو کہ مطلب نہ کھلے۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں: تعقید لفظی اور تعقید معنوی۔

تعقید لفظی یہ ہے کہ نظم عبارت اور ترتیب الفاظ میں خامی و خرابی کی وجہ سے کلام میں ایسی گرہ پڑ جائے کہ مضمون اُلجھ جائے اور مطلب خبط ہو جائے۔ پھر عبارت کی اس خرابی کے

متعدد اسباب ہوسکتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ کسی ایک لفظ یا چند الفاظ کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا کر مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کردیا جائے، یا بلا کسی قرینے کے بعض الفاظ حذف کردیے جائیں، یا کسی قرینے کے بغیر اسم ظاہر کی جگہ اسم ضمیر کا استعمال کیا جائے یا دو متصل رہنے والے کلمات کے درمیان اجنبی مفردات و مرکبات کے ذریعے فصل پیدا کردیا جائے، وغیرہ۔

یہاں نظم عبارت کی خرابی اور ضعف تالیف کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ جب کلام کی بندش نحوی اصولوں کے خلاف ہو تو اس پر ضعف تالیف کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف تعقید کا دارومدار کلام کی پیچیدگی پر ہے، یعنی تعقید اس طرح وجود میں آتی ہے کہ اجزائے کلام میں سے بعض کی تقدیم و تاخیر اور بعض کا حذف اور بعض کا اضمار اگرچہ نحوی قواعد کے لحاظ سے درست ہوتا ہے۔ لیکن ان اسباب میں سے بعض یا سب کے اجتماع کی وجہ سے عبارت میں ایسی خرابی پیدا ہوجاتی ہے کہ کلام میں گرہ پڑ جاتی ہے اور مراد تک رسائی دشوار ہوجاتی ہے۔

اس تعریف اور شوقؔ کی بیان کردہ تعریف میں فرق یہ ہے کہ شوقؔ کے نزدیک لفظ کے اپنے اصلی جگہ پر نہ ہونے ہی کا نام تعقید ہے، خواہ اس تقدیم و تاخیر سے کلام میں کوئی گرہ پڑ جائے یا نہ پڑے اور مضمون الجھ جائے یا نہ الجھے۔ اس کے برخلاف علمائے بلاغت کے نزدیک تعقید میں اصل چیز مراد کی عدم وضاحت اور مضمون کا الجھاؤ ہے نہ کہ الفاظ کا اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جانا۔ لہذا وہ صرف اسی تقدیم و تاخیر پر تعقید کا اطلاق کرتے ہیں جس میں عبارت کا مطلب خبط ہوجائے اور ہیر پھر کے بغیر مضمون کلام تک رسائی نہ ہو۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ علمائے بلاغت کے نزدیک ''تعقید لفظی'' کا سبب صرف بعض الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہی نہیں ہے۔ بلکہ تقدیم و تاخیر کے علاوہ حذف یا اضمار یا التزاماً متصل رہنے والے کلمات کے درمیان فصل بھی اس کے اسباب میں شامل ہیں، بشرطیکہ اس سے عبارت میں پیچ پڑ جائے اور متکلم کی مراد سمجھنے میں دشواری ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تعقید کی غلط تعریف کی وجہ سے شوقؔ کے یہاں خلط مبحث بھی ہوگیا ہے اور وہ تضاد بیانی کا شکار بھی ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں:

''لفظ اپنی اصلی جگہ پر نہ ہوتو اس کو تعقید کہتے ہیں'' اور دوسری جانب یہ بھی فرماتے ہیں: ''نظم میں اگر پورے پورے طور پر اس کا برتاؤ کیا جاتا تو شعر کہنا دشوار ہو جاتا۔ اس سبب سے اکثر جگہ لفظی تعقید معیوب نہیں ٹھہرائی گئی''۔ سوال یہ ہے کہ اگر لفظ کا اپنی اصلی جگہ پر نہ ہونا تعقید ہے اور تعقید منجملہ معائب سخن ہے تو پھر نثر و نظم میں تفریق کیسی؟ جہاں بھی لفظ اپنی اصل جگہ سے ہٹے گا، کلام معیوب قرار پائے گا، خواہ نثر ہو یا نظم۔ اور اگر نظم میں پورے پورے طور پر الفاظ کو اپنی اصلی جگہ پر رکھنا دشوار ہے تو اس کو معائب سخن میں شمار ہی کیوں کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی تضاد بیانی ہے اور اس کی اصل وجہ تعقید کی غلط تعریف ہے۔

اس کے برخلاف اگر تعقید کی اصل اور صحیح تعریف پیش نظر رکھی جائے کہ مضمون کے اس الجھاؤ یا مراد کی اس عدم وضاحت کو تعقید کہتے ہیں جس کا باعث و منشا نظم عبارت کی کوئی خرابی یا انتقال ذہن کی کوئی خامی ہو تو اس پر ایسا کوئی اشکال واقع نہیں ہوگا۔ کلام کی ایسی پیچیدگی نثر یا نظم میں جہاں بھی پائی جائے گی، اس پر تعقید کا اطلاق ہوگا۔

اسی سلسلے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی موقع و محل کا تقاضا ہوتا ہے کہ اجزائے کلام کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا دیا جائے اور اس کو عین بلاغت کہتے ہیں۔ چنانچہ فن معانی میں خصوصیت کے ساتھ یہ مباحث اٹھائے جاتے ہیں کہ اجزائے کلام کو اپنی اصل جگہ سے ہٹانے کے فوائد کیا ہوتے ہیں؟ مثلاً اصل یہ ہے کہ مسند الیہ مقدم اور مسند موخر ہو لیکن وجوہ ذیل کی بنا پر مسند الیہ موخر اور مسند مقدم ہو جاتا ہے:

(الف) مسند الیہ کے ساتھ مسند کی تخصیص کرنی ہو۔ (ب) تفاؤل مدنظر ہو۔ (ج) مسند کی اہمیت ظاہر کرنی ہو۔ (د) تعجب یا تعظیم یا مدح یا ذم یا ترحم یا دعا مقصود ہو۔

اب یہ بات قابل غور ہے کہ شوقؔ کی تعریف کی رو سے جو چیز عیوب کلام میں داخل ہے، وہ موقع و محل کے لحاظ سے عین بلاغت کیسے بن سکتی ہے؟ کیا کلام کے دوسرے عیوب کے ساتھ بھی یہ صورت پیش آتی ہے؟ لیکن اپنے بیان کے مضمرات پر غور کیے بغیر شوقؔ تحریر فرماتے ہیں: ''جب فعل یا مفعول کی تخصیص وغیرہ مراد ہوتی ہے تو اس وقت ان کو فاعل پر مقدم کر لیتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ اس خلط مبحث کا اصل سبب بھی تعقید کی غلط تعریف ہے، تعقید کی صحیح تعریف پر اس قسم

کے اشکالات وارد نہیں ہوتے۔

شوقؔ کے بعد حسرت نے ''نکات سخن'' کے دوسرے باب ''معائب سخن'' میں ''تعقید لفظی'' کا عنوان قائم کر کے شوق کی پوری عبارت (بجز آخری پیراگراف) نقل کردی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''ذیل میں سوداؔ و میرؔ سے لے کر شعرائے عہد حاضر تک کے کلام سے تعقید کی مثالیں درج کی جاتی ہیں، تاکہ ان کو غور سے دیکھ کر لوگ اس عیب سے بچنے کی کوشش کریں''۔ (ص ۹۱)

اس طرح انہوں نے گویا شوقؔ کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ پھر شوق کی بیان کردہ تعریف کی روشنی میں ۱۷ شعراء کے ۲۳ شعر نقل کیے ہیں، جن میں سے صرف چار میں نظم عبارت میں خرابی کی بنا پر تعقید پائی جاتی ہے۔ بقیہ اشعار میں بعض الفاظ کی تقدیم و تاخیر تو ہے لیکن تعقید کی تعریف ان پر صادق نہیں آتی۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ شوق کی اس صراحت کے باوصف کہ نظم میں اکثر جگہ تعقید لفظی معیوب نہیں ٹھہرائی گئی، حسرت نے تمام تر مثالیں شعر ہی سے فراہم کی ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا تضاد ہے۔ تعقید کی اسی بحث کے درمیان حسرت لکھتے ہیں:

''متقدمین میں سودا اور متوسطین میں ذوق کے یہاں تعقید اور تعقید جلی کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں''۔ (ص ۹۱)

چونکہ یہ بیان بھی تعقید کی غلط تعریف پر مبنی ہے۔ اس لیے حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اسی بحث کے آخر میں حسرت نے ذوق کے درج ذیل تین شعر نقل کیے ہیں:

نالہ ان سے ہے بیاں دردِ جدائی کرتا ‌ ‌ ‌ ‌ کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تیمناً ‌ ‌ ‌ ‌ بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہیں

جتنے ہیں یاں مزے ، روش نشۂ شراب ‌ ‌ ‌ ‌ ہوجاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں: ''ذوق کے یہ تینوں شعر تعقید لفظی کے بدترین نمونے ہیں۔ اس باب میں ذوق کی تقلید کسی کے لیے کسی حالت میں جائز نہیں ہوسکتی''۔ (ص ۹۴)

واقعہ یہ ہے کہ حسرت کا یہ بیان ذوق کے خلاف جانب داری پر مبنی ہے۔ ورنہ ان اشعار میں بدترین تعقید تو کیا سرے سے تعقید ہی نہیں ہے کیونکہ ان کی مراد واضح ہے۔ ہاں بعض اجزائے کلام کی تقدیم وتاخیر ضرور ہے۔

جناب شمس الرحمان فاروقی نے ''عروض، آہنگ اور بیان'' کے باب چہارم میں جب معائب سخن کا تنقیدی محاکمہ کیا تو تعقید لفظی سے بھی بحث کی۔ فاروقی صاحب دیدہ ور اور بالغ نظر نقاد ہیں، لہذا انہوں نے شوق وحسرت کی یہ غلطی تو فوراً ہی پکڑ لی کہ اجزائے کلام کا اپنی اصلی جگہ سے ہٹنا کوئی عیب نہیں بلکہ بعض اوقات ضروری یا مستحسن ہوتا ہے۔ یہ دراصل وہی بحث تھی، جسے اہل بلاغت علم معانی میں مسندالیہ، مسند اور متعلقات فعل کی تقدیم وتاخیر کے احوال ومقامات کے ضمن میں بیان کیا کرتے ہیں لیکن بزرگوں کے ساتھ حسن ظن کی بنا پر ان کا ذہن اس طرف بالکل منتقل نہیں ہوا کہ شوق وحسرت نے تعقید لفظی کی تعریف میں کوئی غلطی کی ہے۔ لہذا ان کے تمام نکات ومباحث بذات خود صائب ودرست ہونے کے باوجود عنوان کی غلطی کا شکار ہوگئے۔ مثلاً ان کے درج ذیل بیانات ملاحظہ ہوں:

(الف) اردو کا معاملہ تو یہ ہے کہ تعقید اکثر زور کلام کا باعث ہوتی ہے۔ (ب) ہمارے بہت سے ضرب الامثال تو تعقید کے حامل ہیں۔ (ج) جب نثر یا بول چال میں تعقید اکثر مستحسن یا ضروری یا قابل قبول ٹھہرتی ہے تو اسے شعر بدر کر دینا یا یہ کہنا کہ اگر تعقید ترک کر دینے سے کوئی سقم پیدا ہوتا ہو تو خیر، ورنہ اسے ترک ہی کرنا چاہیے، مناسب نہیں ہے۔ (د) تعقید کا یہ بھی ایک لطف ہے کہ اس سے ایک خوش گوار ابہام پیدا ہوتا ہے۔ (ص ۱۳۷-۱۳۹)

ان تمام بیانات میں تعقید لفظی رتعقید کو ''اجزائے کلام کی اپنی اصل جگہ سے تقدیم و تاخیر'' کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تعقید لفظی کا صحیح اصطلاحی مفہوم ''نظم عبارت کی خرابی کی وجہ سے مراد کی عدم وضاحت'' ہے۔ اس لیے بصورت موجودہ یہ تمام بیانات اہمال کا شکار ہوگئے ہیں۔

اسی طرح ''لغات روزمرہ'' میں ''تعقید لفظی'' کے تحت فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''اردو میں تعقید لفظی کی خاص اہمیت ہے اور کلام میں اثر اور زور لانے

کے لیے اچھے انشاء پرداز اسے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں''۔الخ (ص ۹۷)

عرض ہے کہ یہ سارا اندراج تعقید لفظی کے بجائے اجزائے کلام کی اپنی اصل جگہ سے تقدیم و تاخیر کے تحت کیا جانا چاہیے، تا کہ عنوان کی اندراج سے مطابقت ہوجائے۔ بصورت موجودہ عنوان گمراہ کن ہے۔اسی ذیل میں آگے تحریر فرماتے ہیں:

> ''اردو میں کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ تعقید لفظی کہاں مناسب ہے اور کہاں نہیں؟ لیکن اچھا انشاپرداز خود پہچان لیتا ہے کہ تعقید لفظی کب غلط یا نامناسب لگتی ہے''۔(ص ۹۷)

یہ بیان بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اجزائے کلام کی تقدیم و تاخیر کے قواعد کتب بلاغت میں فن معانی کے تحت مثالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت، لغت اور شعر و ادب کی کتابوں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جائیں تا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ جمہور اہل علم کے نزدیک تعقید کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

محمد بن عبدالرحمان جلال الدین خطیب قزوینی (۶۶۰ھ-۷۳۹ھ) فن بلاغت کی بنیادی کتاب ''تلخیص المفتاح''میں لکھتے ہیں:

> ''کلام کی فصاحت یہ ہے کہ وہ کلمات کی فصاحت کے ساتھ ساتھ ضعفِ تالیف، تنافر کلمات اور تعقید سے خالی ہو......اور تعقید یہ ہے کہ کلام کی دلالت اپنی مراد پر واضح نہ ہو، یا تو نظم عبارت میں کسی خرابی کی وجہ سے...... یا مضمون کی طرف ذہن کے انتقال کی کسی خامی کی وجہ سے''۔ (ص ۹۵)

یہی قزوینی اپنی دوسری تصنیف ''ایضاح التلخیص''میں رقم طراز ہیں: (یہ کتاب پہلی کتاب کی شرح کی طرح ہے)

> ''تعقید یہ ہے کہ کلام کی مراد واضح نہ ہو۔اس کے دو سبب ہوتے ہیں: ایک کا تعلق لفظ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ عبارت کی تنظیم میں کوئی خرابی در آئے اور سامع اس کے معنی تک رسائی کی راہ معلوم نہ کرسکے......تعقید کے دوسرے سبب کا تعلق معنی سے ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے معنی سے دوسرے معنی کی طرف ذہن

منتقل نہ ہو، جو معنی اول کالازم اوراس کی مراد ہو‘‘۔(ص ۱۰۲-۱۰۷)

مسعود بن عمر سعدالدین تفتازانی (۷۱۲ھ-۷۹۱ھ) تلخیص المفتاح کی شرح موسوم بہ ’’مختصرالمعانی‘‘میں تحریرفرماتے ہیں:

’’کلام کی فصاحت یہ ہے کہ وہ کلمات کی فصاحت کے ساتھ ساتھ ضعف تالیف،تنافر کلمات اور تعقید کے عیوب سے خالی ہو......اور تعقید یعنی کلام کی پیچیدگی یہ ہے کہ کلام اپنی مراد کو صاف طور پر نہ بتلائے ۔کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جس کا تعلق عبارت کی تنظیم سے ہو،مثلاً تقدیم یا تاخیر یا حذف یا اضمار یا اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز جو مراد کے سمجھنے میں دشواری پیدا کررہی ہو......یا اس خرابی کا تعلق انتقال ذہن سے ہو۔اس طرح کہ ایسے دوردراز کے لوازم کا ذکر کیا جائے جو بہت سے واسطوں کے محتاج ہوں اور مراد کو بتانے والے قرینے مخفی ہوں‘‘۔(ص۱۹-۲۰)

یہی تفتازانی’’مطول‘‘میں اس مسئلے پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

’’اور تعقید یہ ہے کہ کلام کی دلالت اس کے معنی پر ظاہر نہ ہو کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو نظم عبارت میں پائی جائے ۔ بایں طور کہ الفاظ کی ترتیب معانی کی ترتیب کے مطابق نہ ہو۔تقدیم ، یا تاخیر، حذف ، یا اضمار، یا اس کے علاوہ کسی ایسی چیز کی وجہ سے جو فہم مراد میں دشواری پیدا کررہی ہو۔اگر چہ یہ امور ثابت شدہ اور قواعد زبان کے مطابق ہی کیوں نہ ہوں ۔اس لیے کہ تعقید ایسے امور کے اجتماع کی وجہ سے بھی رونما ہوسکتی ہے،جن میں سے ہر ایک کلام عرب میں رائج الاستعمال ہو۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض کی وجہ سے تعقید پیدا ہورہی ہو،لیکن بحیثیت مجموعی ان امور کے اجتماع نے اس کو زیادہ شدید اور قوی بنادیا ہو‘‘۔(ص ۲۲)

ابن یعقوب المغربی’’مواہب الفتاح شرح تلخیص المفتاح‘‘میں لکھتے ہیں:

’’اور تعقید......وہ یہ ہے کہ کلام متکلم کے معنی مراد کو صاف طور پر نہ

بتائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سامع کے نزدیک بھی معنی غیر واضح ہوں گے اور مراد کلام کی عدم وضاحت کسی خرابی کی وجہ سے ہوگی، جو خرابی یا اس کلام کی نظم وترتیب سے متعلق ہوگی، بایں طور کہ مثلاً تقدیم یا تاخیر کی وجہ سے الفاظ معنی کی ترتیب کے برخلاف ہوجائیں، یا حذف موجب فساد کی وجہ سے الفاظ معانی سے کم ہوجائیں، یا اس کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز جو فہم مراد میں دشواری کا باعث بن جائے مثلاً عطف وہمی یا جر جوار۔ یا اس خرابی کا تعلق انتقال یعنی انتقال ذہن سے ہوگا، لفظ کے معنی اصلی سے کسی دوسرے معنی کی جانب جو اصلی سے متصل ہوں ......، اس لیے کہ کنایہ ومجاز کی فصاحت کی شرط یہ ہے کہ وہ سرعت کے ساتھ سمجھ میں آجائیں''۔(ص ۱۰۲-۱۰۷)

احمد بن بہاء الدین السبکی (۷۱۹ھ-۷۶۳ھ) ''عروس الافراح کی شرح تلخیص المفتاح'' میں رقم طراز ہیں:

''(مصنف کا قول: تعقید یہ ہے کہ کلام کی دلالت اپنی مراد پر واضح نہ ہو کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو یا نظم سے متعلق ہو) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خرابی الفاظ میں پائی جارہی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سامع پر کلام کی نظم و ترتیب بگڑ جائے، پس اسے معنی تک رسائی کی راہ معلوم نہ ہوسکے۔ (مصنف کا قول: یا اس خرابی کا تعلق انتقال سے ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ تعقید کسی معنوی خرابی کی وجہ سے ہو اور وہ یہ ہے کہ معنی ظاہر لفظ سے اصل مراد کی طرف انتقال ذہن واضح نہ ہو''۔(ص ۱۰۲-۱۰۷)

محمد بن احمد دسوقی (ف ۱۲۳۰ھ) ''حاشیہ مختصر المعانی'' میں لکھتے ہیں:

''(مصنف کا قول: اس خرابی کا تعلق ''نظم عبارت'' سے ہو) اس سے مراد ''ترکیب الفاظ'' ہے خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ یہی تعقید لفظی ہے۔ رہی وہ خرابی جس کا تعلق انتقال ذہن سے ہو تو اسی کو تعقید معنوی کہتے ہیں۔ (مصنف کا قول: یا وہ خرابی حذف کی وجہ سے ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حذف بلا کسی واضح

قرینے کے ہو اور اگر حذف کا قرینہ موجود ہو تو تعقید نہ ہوگی۔ اس لیے کہ قرینے کے ساتھ محذوف مذکور کے مانند ہے۔ (مصنف کا قول: یا اس کے علاوہ) جیسے دو متلازم چیزوں کے درمیان کسی اجنبی کے ذریعے فصل کردینا، مثلاً مبتدا و خبر، صفت و موصوف اور بدل و مبدل منہ کے درمیان فصل۔ پھر تم جان لو کہ ترکیب میں خرابی کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کی ترتیب معانی کی ترتیب کے برخلاف ہو"۔ (ص ۱۰۳-۱۰۴)

فن بلاغت کے علاوہ اصطلاحات کی کتابوں میں بھی یہی تعریف مذکور ہے۔ مثال کے طور پر دو بیانات ملاحظہ ہوں۔ علی بن محمد سید شریف جرجانی (۷۴۰ھ-۸۱۶ھ) "التعریفات" میں لکھتے ہیں:

"تعقید: وہ یہ ہے کہ لفظ اپنے معنی مراد کو واضح طور پر نہ بتلائے، کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو یا نظم عبارت سے متعلق ہو، بہ ایں طور کہ الفاظ کی ترتیب معانی کی ترتیب کے مطابق نہ ہو اور اس کا سبب تقدیم ہو یا تاخیر ہو یا حذف ہو یا اضمار ہو یا اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز ہو جس سے فہم مراد میں دشواری پیش آرہی ہو۔ یا عدم وضاحت کسی ایسی خرابی کی وجہ سے ہو جس کا تعلق انتقال ذہن سے ہو یعنی معنی اول سے (جو لغت سے سمجھے جارہے ہیں) معنی ثانی (جو مقصود ہیں) کی طرف ذہن منتقل نہ ہو رہا ہو ایسے لوازمات کے ذکر کی وجہ سے جو بہت سے واسطوں کے محتاج ہوں"۔ (ص ۸۶)

اسی طرح شیخ محمد اعلی التھانوی (ف ۱۱۸۵ھ) "کشاف اصطلاحات الفنون" میں تحریر فرماتے ہیں:

"تعقید بروزن تصریف۔ اہل بیان کے نزدیک مراد کلام کا غیر واضح ہونا ہے، کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو نظم عبارت میں پائی جائے۔ یا عدم وضاحت کسی ایسی خامی کے سبب ہو جو انتقال ذہن سے متعلق ہو، حالانکہ مقصود کلام مراد کو بتانا ہو۔ لہذا اس تعریف سے متشابہ خارج ہو گیا، کیونکہ متشابہ سے مقصود آزمائش

ہوتی ہے نہ کہ فہمائش اور مشترک و مجمل اس میں داخل نہ ہوں گے کیونکہ ان دونوں میں کوئی خرابی نہیں ہوتی، نہ نظم عبارت میں اور نہ انتقال ذہن میں اور تعقید مطلقاً مخل فصاحت ہے خواہ لفظی ہو یعنی وہ جس کا سبب نظم عبارت کی کوئی خرابی ہو یا معنوی ہو یعنی وہ جس کا سبب انتقال ذہن کی کوئی خامی ہو''۔

یہ متقدمین کے بیانات تھے۔ بیسویں صدی میں علی الجارم اور مصطفیٰ الامین دو مصری عالموں نے البلاغۃ الواضحۃ ترتیب دی ہے۔ اس میں تعقید لفظی کی بابت یہ اندراج ملتا ہے:

''اور ضروری ہے کہ عبارت تعقید سے خالی ہو اور وہ یہ ہے کہ معنی مراد پر کلام کی دلالت واضح نہ ہو، الفاظ کو اپنی جگہ سے موخر یا مقدم کر دینے کی وجہ سے یا ان کلمات کے درمیان فصل کی وجہ سے جن کا ایک دوسرے سے متصل اور مجاور رہنا ضروری ہے''۔ (ص ٦)

یہ عربی مصنّفین کی عبارتیں تھیں[۱]۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعقید سے متعلق فارسی مصنّفین اور فرہنگ نویسوں کے بیانات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

علی اکبر دہخدا نے ''لغت نامہ دہخدا'' میں اس سلسلے میں قدیم ترین بیان تعریفات جرجانی سے نقل کیا ہے۔ یہ سید شریف جرجانی (۷۴۰ھ-۸۱٦ھ) کی اس عربی عبارت کا فارسی ترجمہ ہے جسے ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں:

تعقید آنست کہ دلالت لفظ بر معنی مقصود آشکار نباشد۔ بہ خاطر خللے کہ در نظم عبارت ست۔ چنانکہ بسبب تقدیم یا تاخیر یا حذف یا اضمار یا جز آں ترتیب الفاظ بروفق ترتیب معانی نباشد وموجب دشواری فہم مقصود گردد۔ وخللے کہ در انتقال ذہن بہ معنی مقصود بود	تعقید: یہ ہے کہ معنی مقصود پر لفظ کی دلالت واضح نہ ہو، کسی ایسی خرابی کی وجہ سے جو نظم عبارت میں ہو۔ مثلاً تقدیم یا تاخیر یا حذف یا اضمار یا اس کے علاوہ کسی وجہ سے الفاظ کی ترتیب معانی کی ترتیب کے مطابق نہ ہو اور فہم مقصود میں دشواری کا باعث بن جائے۔ یا یہ عدم وضاحت کسی ایسی خرابی کی وجہ سے

[۱] فاضل مقالہ نگار نے اصل عربی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے یہاں ان کا ترجمہ ہی دیا

گیا۔ (معارف)

از جہت ایراد لوازم بعید کہ محتاج وسایط بسیار بود و قرینہ بر مقصود خفی باشد۔ (ص ۵۹۶۸)	ہو، جس کا تعلق معنی مقصود کی طرف انتقال ذہن سے ہو، ایسے لوازم بعیدہ کے ذکر کی وجہ سے جو بہت سے واسطوں کے محتاج ہوں اور مراد کا قرینہ مخفی ہو۔

سید عبدالرشید الحسینی المدنی ٹھٹھوی (ف ۱۰۷۷ھ) ''منتخب اللغات'' میں لکھتے ہیں:

تعقید پوشیدہ سخن گفتن چنانچہ نیک نتواں یافت۔ (ص ۱۰۶)	مبہم بات کہنا اس طرح کہ اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکے۔

نظام الدین احمد محمد صالح صدیقی مجمع الصنائع (تصنیف ۱۰۶۰ھ) میں تحریر کرتے ہیں:

تعقید لفظی : چناں باشد کہ در کلام ترتیب الفاظ موافق ترتیب معنی نبود بلکہ الفاظ مقدم و موخر واقع شود	تعقید لفظی اس طرح ہوتی ہے کہ کلام میں الفاظ کی ترتیب معنی کی ترتیب کے مطابق نہ ہو بلکہ الفاظ مقدم و موخر ہو جائیں۔

سراج الدین علی خاں آرزو (۱۱۰۱ھ-۱۱۵۹ھ) موہبت عظمیٰ میں لکھتے ہیں:

فصاحت کلام : خلوص آنست از ضعف تالیف و تنافر کلمات و تعقید با فصاحت کلمات۔ (ص ۵)	کلام کی فصاحت یہ ہے کہ وہ کلمات کی فصاحت کے ساتھ ساتھ ضعف تالیف، تنافر کلمات اور تعقید سے خالی ہو۔

اسی کتاب میں آگے تحریر کرتے ہیں:

تعقید بودن کلام ست غیر ظاہر الدلالۃ بر معنی مراد وآں یا بسبب اختلال در نظم ویا بسبب خللے ست کہ واقع شود در انتقال ذہن بسبب دوری نسبت واز جملہ عجائب ست دریں مقام انچہ علامہ احراری گفتہ کہ تعقید لفظی را در وقت وضوح مطلب	تعقید کلام کا معنی مراد پر غیر ظاہر الدلالت ہونا ہے اور یہ یا تو نظم عبارت میں کسی خرابی کی وجہ سے ہوگا اور یہ دوری نسبت کی وجہ سے انتقال ذہن میں کسی خرابی کی بنا پر ہوگا، اس موقع پر علامہ احراری نے یہ جو کہا ہے کہ مراد واضح ہونے کی صورت میں تعقید لفظی کو

جایز داشته اندزیرا که اگر خلل در نظم کلام باشد بتقدیم وتاخیر وفصل ووصل وجزاینها پس لفظی ست و اگر در انتقال ذہن پس معنوی وبہر تقدیر اختلال ظاہر ست ودریں ہنگام اقرار وضوح مطلب از کمال قلت تدبرست۔ (ص۶)

جائز رکھا گیا ہے توان کی یہ بات من جملہ عجائبات ہے۔ کیونکہ اگر تقدیم و تاخیر وفصل و وصل وغیرہ کی وجہ سے خرابی نظم کلام میں ہوگی تو تعقید لفظی ہوگی اور اگر خرابی انتقال ذہن میں ہوگی تو تعقید معنوی ہوگی اور بہر تقدیر کلام کا خلل پذیر ہونا ظاہر ہے۔ پس اس صورت میں مراد کی وضاحت کا اقرار کمال قلت تدبر کی وجہ سے ہے۔

سیال کوٹی مل وارستہ (ف ۱۱۸۰ھ) مطلع السعدین میں رقم طراز ہیں:

فصاحت کلام: برات آں از ضعف تالیف وتنافر کلمات وتعقید۔

فصاحت کلام ضعف تالیف، تنافر کلمات اور تعقید سے اس کا پاک ہونا ہے۔

اسی کتاب میں آگے لکھتے ہیں:

تعقید: وآں دونوع ست: لفظی ومعنوی امالفظی نبودن ترتیب لفظی ست موافق ترتیب معنی بسبب تقدیم و تاخیر یا حذف آنچہ باید ...... اما تعقید معنوی آنست کہ کلام غیر ظاہر الدلالت باشد بنا برصعوبت انتقال ذہن بہ ادراک مضمون از جہت آوردن لوازم بعیدہ کہ محتاج بہ وسائط کثیرہ باشد باوجود خفاے قرائن مدل۔

تعقید اس کی دو قسمیں ہیں: لفظی اور معنوی جہاں تک تعقید لفظی کا تعلق ہے تو ترتیب لفظی کا ترتیب معنوی کے مطابق نہ ہونا ہے، تقدیم وتاخیر یا حذف وغیرہ کی وجہ سے......، رہی تعقید معنوی تو وہ یہ ہے کہ ادراک مضمون کی جانب انتقال ذہن کی دشواری کی وجہ سے کلام کی دلالت غیر واضح ہو، ایسے دور دراز کے لوازم کے لانے کی وجہ سے جو بہت سے واسطوں کے محتاج ہوں اور مراد کے رہنما قرائن مخفی ہوں۔

حسن عمید فرہنگ عمید میں رقم طراز ہیں:

تعقید: در اصطلاح ادب شعر یا سخن پیچیدہ گفتن وکلمات و کنایات دور از ذہن آوردن وآں برد وقسم ست تعقید لفظی وتعقید معنوی۔ خوانندہ نتواند معنی کلام را بہ سہولت درک کند (۱/۵۸۹)	تعقید: ادب کی اصطلاح میں پیچیدہ شعر یا پیچیدہ بات کہنا اور دور از ذہن کلمات و کنایات استعمال کرنا۔ اس کی دو قسم ہیں تعقید لفظی اور تعقید معنوی۔ تعقید لفظی: یہ ہے کہ الفاظ کی پیچیدگی اور کلمات وضمائر کی درہمی کی وجہ سے سننے والا اور پڑھنے والا مراد کلام کا بہ سہولت ادراک نہ کر سکے۔

ابوالقاسم رادفر فرہنگ بلاغی ادبی میں لکھتے ہیں:

تعقید لفظی: دلالت کلام بر مراد ظاہر نباشد بواسطۂ فاصلہ اجنبی کہ درمیان نظم یا نثر واقع شود۔ (۱/۳۸۱)	تعقید لفظی: کسی اجنبی کے فاصلے کی وجہ سے جو نظم یا نثر کے اجزا کے درمیان واقع ہو، مراد پر کلام کی دلالت واضح نہ ہو۔

ڈاکٹر معین فرہنگ فارسی میں تحریر کرتے ہیں:

تعقید لفظی: آنست کہ بہ سبب پیچیدگی الفاظ خوانندہ وشنوندہ معنی کلام را بہ آسانی در نیابد۔ (۱/۱۱۰۳)	تعقید لفظی: یہ ہے کہ الفاظ کی پیچیدگی کی وجہ سے پڑھنے والا اور سننے والا معنی کلام کو بہ آسانی دریافت نہ کر سکے۔

سلسلۂ گفتگو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں اردو مصنّفین بلاغت ولغت نگاروں کے بیانات بھی پیش کر دیے جائیں:

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (ف ۱۳۲۲ھ) تذکرۃ البلاغہ میں لکھتے ہیں:

> کلام فصیح اس کو کہتے ہیں جس کے تمام الفاظ فصیح ہوں اور ضعف تالیف وتنافر کلمات اور تعقید سے خالی ہو۔ (ص ۵)

آگے لکھتے ہیں:

> ''تعقید کے یہ معنی ہیں کہ مطلب کلام کا ظاہر نہ ہو یا تو اس سبب سے کہ نظم کلام میں بسبب تقدیم یا تاخیر یا حذف وغیرہ کے کچھ خلل ہے۔ اس کو تعقید

لفظی کہتے ہیں یا مطلب کلام اس وجہ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ متکلم کے مطلب تک بذریعہ لوازم بعیدہ و وسایط کثیرہ خفیہ غیر مذکور رسائی ہوتی ہے۔ پس وسایط کثیرہ اور ان کا مذکور نہ ہونا باعث تعقید کلام ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تعقید کو تعقید معنوی کہتے ہیں''۔ (ص ۶و۷)

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری (۱۲۷۶ھ-۱۳۵۱ھ) بحر الفصاحت میں تحریر کرتے ہیں:

تعقید: تعقید کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کلام اپنے معنوں پر بہ ظاہر دلالت نہ کر سکے یعنی دلالت تو ہوتی ہے مگر صریح نہ ہو اور یہ دو قسم ہے، تعقید لفظی اور تعقید معنوی۔

تعقید لفظی: یہ ہے کہ بسبب تقدیم و تاخیر و وصل و فصل الفاظ کے کلام میں خلل واقع ہو۔

تعقید معنوی: یہ ہے کہ عبارت میں خیالات باریک یا قصہ نامشہور یا کسی طرح کی مشکل بات لکھیں اور جب تک بہت خوض و تامل نہ کریں اس کا سمجھنا دشوار ہو۔ (ص ۱۰۵۳-۱۰۵۴)

نور الحسن نیر کاکوروی (۱۲۸۲ھ-۱۳۵۵ھ) نور اللغات میں رقم طراز ہیں:

''تعقید: پوشیدہ بات کہنا، گرہ دینا (اصطلاح علم معانی) قاعدے کے خلاف لفظوں کا آگے پیچھے کر دینا جس سے معنی سمجھنے میں کسی قدر دقت ہو۔ اس کو تعقید لفظی کہتے ہیں۔ تعقید معنوی یہ ہے کہ خاص لفظ سے شاعر کی مراد کچھ ہو اور محل استعمال میں وہ لفظ کچھ معنی دے رہا ہو''۔ (ص ۹۶۷)

سید مسعود حسن رضوی ادیب (۱۸۹۳ء-۱۹۷۵ء/ ۱۳۱۱ھ-۱۳۹۵ھ) روح انیس کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

''جملے میں لفظوں کی ترتیب میں خلل پڑنے سے۔ سلسلہ عبارت میں کسی کڑی کے چھوٹ جانے سے صحیح مطلب سمجھنا مشکل ہو جائے تو ان دونوں صورتوں کو تعقید کہتے ہیں۔ پہلی کو تعقید لفظی اور دوسری کو تعقید معنوی''۔ (ص ۲۰۲)

مولانا عزیز الحق کوثر ندوی (۱۹۱۰ء- ۱۹۹۳) اپنی کتاب فصاحت و بلاغت میں تحریر کرتے ہیں:

''فصاحت کلام : یہ ہے کہ کلام ان تین عیبوں سے پاک ہو: تنافر کلمات سے، ضعف تالیف سے، تعقید سے''۔(ص ۲۴)

آگے لکھتے ہیں:

''تعقید: یہ ہے کہ کلام میں گرہ پڑ جائے، یعنی ایسی پیچیدگی ہو کہ نہ کھلے۔ تعقید کی دو قسمیں ہیں: لفظی اور معنوی۔ تعقید لفظی سے مراد یہ ہے کہ جو لفظ جہاں رکھنا چاہیے وہاں نہ رکھا جائے بلکہ اپنی جگہ سے اس طرح ہٹا کر رکھا جائے کہ مطلب خبط ہوجائے۔ تعقید معنوی سے مراد یہ ہے کہ ایسے ضروری پرزے گرا دیے جائیں کہ مطلب خبط ہوجائے اور ذہن اصلی مقصد تک نہ پہنچ سکے''۔(۲۵و۲۶)

مولانا کوثر ندوی اپنی دوسری تصنیف ''اصول بلاغت'' میں اس مسئلے پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''اگر ترتیب کے بگڑ جانے سے عبارت کچھ ایسے بگڑ جائے کہ مطلب میں دقت ہو تو اسی کا نام ہے بندش کا الجھاؤ اور ترکیب کی تعقید اور پیچیدگی''۔

ناسخ کا ایک شعر ہے:

ذبح وہ کرتا ہے تو پھر چاہیے اے مرغ دل   دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

دوسرے مصرعے میں بندش میں اتنا الجھاؤ ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

''یہ تعقید نہایت بے طور واقع ہوئی ہے۔ (آب حیات) دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا۔ یہ بتاتا ہے کہ صیاد کا تڑپنا دیکھ کر مرغ دل کا دم پھڑک جائے مگر شاعر کا یہ مطلب نہیں، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مرغ دل کا تڑپنا دیکھ صیاد کا دم پھڑک جائے بندش بگڑ گئی اور مطلب الجھ گیا۔ اس عیب کو فن معانی

میں ''تعقید'' کہتے ہیں''۔ (ص ۶۸-۶۹)

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تعقید کی بنیادی شرط پیچیدگی، الجھاؤ اورابہام ہے، نہ کہ لفظ کا محض اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جانا، تفتازانی فرماتے ہیں'' صعوبة الفهم فی مناط التعقید''(صعوبت فہم ہی پر تعقید کا دارومدار ہے) اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ شوق نیموی کو تعقید لفظی کے سلسلے میں وہم ہوااورانہوں نے اس اصطلاح کی ایسی تعریف لکھ دی جس کی تائید عربی، فارسی اور اردو کتب بلاغت یا کتب لغات سے نہیں ہوتی۔

اس بحث کے اختتام سے پہلے چند توضیحات بھی ضروری ہیں:

(الف) بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ''لغت نامۂ دہخدا'' میں ''تعقید'' کے ذیل میں یہ عبارت ملتی ہے:

''باصطلاح علم معانی تاخیر وتقدیم کردن الفاظ بہ جہت رعایت وزن''۔

(۴؍۵۹۶۸)

اس سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ پیچیدگی، ابہام اور عدم وضاحت مراد کے بغیر محض الفاظ کی تاخیر وتقدیم پر بھی تعقید کا اطلاق ہوتا۔ لہذا شوق کی تعریف غلط اور بے اصل نہیں ہے۔

یہاں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دہخدا کی اس عبارت کا اصل ماخذ مولوی غیاث الدین رام پوری کی ''غیاث اللغات'' ہے۔ غیاث صاحب سے فرہنگ آنند راج (۲؍۱۱۲۹) نے نقل کیا ہے اور آنندراج سے دہخدا نے لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ صاحب غیاث نے اسے ''علم معانی کی اصطلاح'' بتایا ہے۔ لیکن گذشتہ صفحات میں پیش کردہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ مولف غیاث کا حوالہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ علم معانی کی کسی کتاب میں تعقید کی یہ تعریف مذکور نہیں ہے۔ تیسرے خود صاحب غیاث نے زیر بحث عبارت سے پہلے اور بعد میں ''تعقید'' کے تحت جو کچھ لکھا ہے، نیز جو مثالیں درج کی ہیں، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعقید کی تعریف کے سلسلے میں ان کی رائے جمہور اہل علم سے مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ ذیل میں ان کی پوری عبارت نقل کی جاتی ہے:

تعقید: پوشیدہ سخن گفتن چنانکہ نیک نتواں تعقید: بات کو اس طرح چھپا کر کہنا کہ بخوبی سمجھ

دریافت، وبسیار گرہ زدن، و بہ اصطلاح
علم معانی تقدیم و تاخیر کردن الفاظ بہ
جہت رعایت وزن ۔ ودر مصطلحات
نوشتہ کہ تعقید دوقسم ست: معنوی ولفظی ۔
معنوی آنست: کلامیکہ غیر ظاہر الدلالت
باشد بر معنی مقصود از جہت عدم انتقال
ذہن از معنی لغوی بہ سوے معنی مقصود ۔
ومتکلم بنا بر ذکر لوازم بعیدہ بہ حیاطت
وسایط کثیر با وصف انتفاء قرائن ولفظی
آنست: کلامیکہ غیر ظاہر الدلالت باشد
بر معنی مقصود از جہت تقدیم یا تاخیر الفاظ
یا سببے دیگر از حذف وامثال آں کہ
موجب دشواری فہم معنی باشد ۔ وایں دو
قسم از معائب فصاحت وبلاغت ست ۔
وبعضے نوشتہ کہ لفظی عیب ست ومعنوی ہنر
مثال تعقید لفظی، مصرع

چوں برانی می کنم افغان وزاری زیں درم

مثال تعقید معنوی بیت:

ازاں سو ہزار وازیں سو ہزار
چوں باہم زدہ گشتہ دہ صد ہزار (ص۱۰۱)

میں نہ آئے، بہت گرہ لگانا اور علم معانی کی اصطلاح
میں وزن کی رعایت کی وجہ سے الفاظ کو آگے
پیچھے کر دینا اور مصطلحات میں لکھا ہے کہ تعقید
کی دو قسمیں ہیں: معنوی اور لفظی ۔ معنوی یہ
ہے: کلام کی دلالت معنی مقصود پر غیر واضح ہو،
معنی لغوی سے معنی مقصود کی جانب ذہن کے
منتقل نہ ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ
متکلم نے نفی قرائن کے باوجود وسایط کثیرہ کے
احاطے کے ساتھ لوازم بعید کا ذکر کیا ہو ۔ لفظی
یہ ہے: کلام کی دلالت معنی مقصود پر غیر ظاہر ہو
الفاظ کی تقدیم یا تاخیر یا حذف یا اس کے علاوہ
کسی ایسے سبب سے جو فہم معنی میں دشواری کا
موجب ہو ۔ تعقید کی یہ دونوں قسمیں فصاحت
و بلاغت کے معائب میں سے ہیں اور بعض
لوگوں نے لکھا ہے کہ تعقید لفظی عیب اور تعقید
معنوی ہنر ہے ۔ تعقید لفظی کی مثال، ع:

چوں برانی می کنم افغان وزاری زیں درم

"جب تم اس دروازے سے مجھے نیچے بھگاتے
ہو میں آہ وزاری کرتا ہوں"

تعقید معنوی کی مثال، بیت:

ازاں سو ہزار وازیں سو ہزار
چوں باہم زدہ گشتہ دہ صد ہزار (ص۱۰۱)

(ادھر سے ہزار اور ادھر سے ہزار کو جب ضرب

دیا گیا تو دس لاکھ ہوگئے)

اس اقتباس میں تعقید کے معنی لغوی نیز تعقید لفظی و معنوی کی تعریف سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ مسلک جمہور کے مطابق ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ زیر بحث عبارت یا تو سہو پر مبنی ہے یا اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ بہ تقدیر ثانی اس کی ایک توجیہ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس عبارت میں مولف غیاث اللغات غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کلام منظوم میں عموماً تعقید اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وزن کی رعایت کے لیے شاعر الفاظ کو اس طرح مقدم و موخر کر دیتا ہے کہ نظم عبارت میں خرابی آجاتی ہے اور بغیر ہیر پھیر کے مفہوم سمجھ میں نہیں آتا اور '' اصطلاح علم معانی '' کہنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ عربی کتب بلاغت میں تعقید لفظی کی مثال میں فرزدق کا جو شعر عام طور پر نقل کیا جاتا ہے، اس کی یہی کیفیت ہے کہ وزن کی رعایت کی وجہ سے اس میں متعدد الفاظ اس طرح مقدم و موخر ہو گئے ہیں کہ شدید تعقید پیدا ہوگئی ہے۔ شعر یہ ہے:

وما مثله فی الناس الا مملکا ابو امه حی ابوه یقاربه

اس میں الفاظ کی صحیح ترتیب اس طرح ہے:

"وما مثله فی الناس حی یقاربه الا مملکا ابو امه ابوه"۔

(انسانوں میں اس جیسا کوئی زندہ موجود نہیں ہے جو اس کا قریبی ہو، سوائے اس بادشاہ کے جس کی ماں کا باپ اس کا باپ ہے) یعنی ممدوح کے ماموں، خلیفہ وقت ہشام بن عبد الملک کے علاوہ کوئی ممدوح کا مثل نہیں ہے۔

علامہ تفتازانی اس شعر میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کلام میں ایسی تعقید ہے جو مخفی نہیں اور اس کے کئی اسباب ہیں؛ ایک تو مبتدا (ابو امہ) اور خبر (ابوہ) کے درمیان فصل۔ دوسرے موصوف (حی) اور صفت (یقاربہ) کے درمیان فصل۔ تیسرے بدل (حی) اور مبدل منہ (مثلہ) کے درمیان فصل۔ چوتھے مستثنیٰ (مملکا) کی مستثنیٰ منہ (حی) پر تقدیم اور یہ موخر الذکر اگرچہ جائز ہے لیکن ناگوار ہے۔ کیونکہ اس سے تعقید میں اضافہ ہو رہا ہے۔ (اضافے کی بات اس لیے کہی گئی) کیونکہ تعقید شدت اور ضعف کو قبول کرنے والی چیز ہے)

اوپر صاحب غیاث اللغات کی سہو کی بات کہی گئی ہے، یہ بھی چنداں مستبعد نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسی اقتباس میں انہوں نے ''در مصطلحات نوشتہ'' کہہ کر جو عبارت نقل کی ہے وہ وارستہ کی ''مصطلحات شعرا'' میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ مصطلحات میں سرے سے تعقید کا ذکر ہی نہیں ہے۔ گویا اس حوالے میں بھی انہیں سہو ہوا ہے۔ غالباً مطلع السعدین کے بجائے انہوں نے مصطلحات کا نام لے لیا ہے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ مولف غیاث نے تعقید معنوی کی مثال میں جو شعر پیش کیا ہے، بہ ظاہر اس میں کوئی تعقید نظر نہیں آتی۔ البتہ اسے معنویت سے عاری کلام موزوں کی مثال قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر راقم کا یہ خیال درست ہے تو تعقید کی یہ تمثیل بھی مولف موصوف کا ایک سہو ہے۔

(ب) تعقید کے باب میں شوق وحسرت کے علاوہ فاروقی صاحب کو غالب کے ایک بیان نے بھی مغالطے میں مبتلا کیا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین　　　کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دم آہ و فغاں اور

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی نے بعض دوسرے اشعار کے ساتھ غالب سے اس شعر کا مفہوم دریافت کیا۔ اس کے جواب میں غالب نے انہیں لکھا:

> ''یہ بہت لطیف تقریر ہے، لیتا کو ربط ہے، ''چین'' سے۔ کرتا مربوط ہے ''آہ وفغاں'' سے۔ عربی میں تعقید لفظی ومعنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا''۔ (غالب کے خطوط، ۴/۱۵۱۳)

غالب کے مذکورہ بالا شعر میں فعل اور مفعول کے درمیان جملہ معترضہ سے فصل واقع ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے مراد تک رسائی میں قدرے دشواری بھی ہو رہی ہے، لہذا غالب کا یہ مان لینا کہ اس شعر میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے بالکل درست ہے۔ البتہ غالب کا یہ کہنا کہ ''فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور ملیح دعوی بلا دلیل ہے لیکن فاروقی صاحب

نے خوش گمانی سے کام لیتے ہوئے لکھ دیا ہے:

''ظاہر ہے کہ فارسی کی حد تک غالب کا بیان حسرت یا شوق نیموی یا اچھے اچھوں سے زیادہ مستند ہے''۔

اس لیے مناسب ہوگا کہ اگر یہاں اس کا جائزہ لیا جائے کہ غالب کا متذکرہ بالا بیان کس حد تک قابل استناد ہے؟ ناچیز راقم کے مطالعے اور علم کی حد تک فارسی مصنّفین بلاغت اور فرہنگ نویسوں نے (وہ قدیم ہوں یا جدید) عام طور پر تعقید کو معائب سخن ہی میں شمار کیا ہے اور اس باب میں تعقید لفظی و معنوی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ تمام اقتباسات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں جو گذشتہ صفحات میں نقل کیے گئے۔ البتہ وارستہ نے مطلع السعدین میں ایک نئی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر چہ علمائے تازی و پیشوایان عجمی ہر دو قسم تعقید را ز معائب نوشتہ اند، لیکن در کلام استاداں بیشتر یافتہ می شود، چنانکہ متتبع دیوان خاقانی شروانی می داند کہ اکثر اشعار آں معنی یاب معقد واقع شدہ وازیں رو محسن تاثیر گفتہ:

زرشکست مہر تاباں بسکہ در دل عقدہا دارد
معقد مصرعے از شعر خاقانی ست پنداری۔

اگر چہ علمائے عرب اور پیشوایان عجم نے تعقید کی دونوں قسموں کا شمار معائب میں کیا ہے لیکن یہ استادوں کے کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ خاقانی شروانی کے دیوان میں تلاش و تفحص کرنے والا جانتا ہے کہ اس معنی یاب کے اکثر اشعار معقد واقع ہوئے ہیں۔ اسی لیے محسن تاثیر نے کہا ہے: تمہارے رشک کی وجہ سے مہر تاباں کے دل میں بہت سی گرہیں پڑ گئی ہیں گویا وہ شعر خاقانی کا کوئی پیچیدہ مصرع ہے۔

غالباً وارستہ کے اسی بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غیاث الدین رام پوری تحریر فرماتے ہیں:

وایں دو قسم از معائب فصاحت و بلاغت ست، و بعضے نوشتہ کہ لفظی عیب ست

تعقید کی یہ دونوں قسمیں فصاحت و بلاغت کے معائب میں سے ہیں اور بعض لوگوں نے لکھا

ومعنوی ہنر۔ ہے کہ تعقید لفظی عیب اور تعقید معنوی ہنر ہے۔

وارستہ کا محولہ بالا اقتباس فرہنگ آنندراج (۱۱۲۹/۲) میں مطلع السعدین کے حوالے سے اور لغت نامہ دہخدا میں آنندراج کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فارسی کتب بلاغت و لغات سے غالب کے بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ چنانچہ وارستہ صراحت کرتے ہیں کہ علمائے عرب کی طرح پیشوایان عجم بھی تعقید کی دونوں قسموں کو معائب میں شمار کرتے ہیں۔ غیاث الدین رام پوری بھی تعقید لفظی و معنوی دونوں کو منجملہ معائب فصاحت و بلاغت بتاتے ہیں۔ البتہ خود وارستہ کا رجحان تعقید معنوی کو جائز قرار دینے کی جانب ہے۔ رام پوری کے مطابق بھی بعض لوگ ہنر قرار دیتے ہیں تو تعقید کو نہ کہ لفظی کو۔

پس ثابت ہوا کہ متعدد لغوی بیانات کی طرح (جس کی تفصیل پروفیسر نذیر احمد کی ''نقد قاطع'' میں مذکور ہے) فارسی میں تعقید کو جائز بلکہ فصیح و بلیغ ٹھہرانے سے متعلق غالب کا متذکرہ بالا بیان بھی حقیقت سے دور اور غیر مستند ہے۔

خود اردو کا یہ احوال ہے کہ مصنّفین بلاغت کے علاوہ مصحفی، انیس اور مسرور نے اپنے اشعار میں اور محمد حسین آزاد، شبلی، فرحت اللہ بیگ اور مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے نثری فقروں میں اس اصطلاح کا استعمال معائب سخن ہی کے سیاق میں کیا ہے۔

(ج) تعقید کی اصل حقیقت غموض، الجھاؤ اور پیچیدگی ہے یا الفاظ کا اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جانا؟ اس کا فیصلہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ تعقید کے لغوی معانی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس لیے کہ لغوی و اصطلاحی معنوں کے درمیان مناسبت کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اسماعیل بن حماد الجوہری (ف ۴۵۳ھ) کی صحاح کو دیکھتے ہیں:

عقد الرب وغیره ای غلط ، فهو عقید واعقدته وعقدته تعقیدا قال الکسائی : یقال للقطران والرب ونحوه : اعقدته حتی تعقد وکلام معقد ای مغمص (۵۰۷/۱)

عقد الرب وغیره : شیرے کا گاڑھا ہونا، عقیدہ: گاڑھا شیر وغیرہ۔

اعقدته وعقدته تعقیدا : گاڑھا کرنا۔ کسائی نے کہا: تارکول اور شیرے

وغیرہ کے لیے کہا جاتا ہے۔ اعقدته حتی تعقد : میں نے اس کو گاڑھا کیا تا آنکہ وہ گاڑھا ہو گیا۔ کلام معقد : یعنی کلام مبہم۔

مجدالدین فیروز آبادی (ف ۸۱۷ھ) القاموس المحیط میں لکھتے ہیں :

عقدته تعقیدا : اغلیته حتی غلظ ...... المعقد کمحدث : الساحر وکمعظم : ای مغمص (۱/۳۱۶)عقدته تعقیدا جوش دینا یہاں تک کہ گاڑھا ہو جائے۔معقد بر وزن محدث : جادوگر، معقد بروزن معظم : کلام غامض۔

مولانا عبد الحفیظ بلیاوی (ف ۱۹۷۱ء) مصباح اللغات میں تحریر فرماتے ہیں : عقد البیت : محراب بنانا۔ عقد الحبل : رسی میں گرہ لگانے میں مبالغہ کرنا۔ عقد الکلام : مبہم کلام کرنا۔ (ص ۵۶۶)

ان ہی معانی کا ذکر فارسی لغت نگاروں نے بھی کیا ہے۔ ''لغت نامہ دہخدا'' سے چند عبارتیں ملاحظہ ہوں :

تعقید : ۱- بستہ شدن (دھار) ستبر گردانیدن دارد و جز آں (تاج المصادر بیہقی) جوشانیدن وسطبر گردانیدن (منتہی الادب) جوشانیدن چیزے تا غلیظ شود (آنندراج)

۲- بسیار گرہ کردن و استوار کردن (تاج المصادر بیہقی) گرہ دار ساختن بنارا (منتہی الادب)

۳-مبہم کردن سخن (تاج المصادر بیہقی) پوشیدہ سخن گفتن چنانکہ نیک نتواں یافت (غیاث اللغات) پیچیدہ ساختن کلام چنانکہ بہ آسانی معنی آں آشکار نگردد (تعریفات جرجانی) (۴/ ۵۹۶۷-۵۹۶۸)

اردو لغات میں صاحب نور اللغات'' لکھتے ہیں :

تعقید : پوشیدہ بات کہنا، گرہ دینا (ص ۹۶۷)

''اردو لغت تاریخی اصول پر'' میں درج ہے :

تعقید: ۱-گرہ دینا، پوشیدہ بات کہنا۔ ۲-گرہ، گانٹھ، بندش۔ ۳- جماؤ، بستگی،
بندھنا، گرہ دار ہونا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تعقید کے لغوی معانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تعقید کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں مسلک جمہور کو درست قرار دیا جائے تا کہ لغوی اور اصطلاحی معنوں کے درمیان مناسبت قائم رہے۔ شوقؔ کی تعریف کو درست ماننے کی صورت میں یہ مناسبت برقرار نہیں رہتی۔

(د) گذشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ فصاحت کلام اور تعقید کی تعریف وغیرہ سے متعلق بنیادی باتیں خطیب قزوینی نے ''تلخیص المفتاح'' میں کہی ہیں پھر ''ایضاح'' میں خود ہی اس کی توضیح کی ہے۔ اس کے بعد شارحین ''تلخیص'' کی پوری جماعت نے جن میں تفتازانی سرفہرست ہیں، ان ہی امور کو مزید منقح، مہذب اور مفصل کیا ہے۔ پھر یہی اصول وفروع پہلے فارسی پھر اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ قزوینی کے اصل ماخذ یعنی سکّاکی کی ''مفتاح العلوم'' میں اس موقع پر کیا مذکور ہے؟ وہ تحریر فرماتے ہیں:

واما الفصاحة فهى قسمان راجع الى المعنى وهو خلوص الكلام عن التعقيد ، وراجع الى اللفظ وهو ان تكون الكلمة عربية اصلية وعلامة ذلك على السنة الفصحاء من العرب الموثوق بعربيتهم أدور واستعما لهم اكثر ، لا مما احد ثها المولدون ولا مما اخطأت فيه العامة وان تكون اَجرى على قوانين اللغة وان تكون سليمة عن التنا فر ۔

والمراد بتعقيد الكلام هو ان يعثر صاحبه فكرك فى متصرفه و يشيك طريقك الى المعنى ويوعّر مذهبك نحوه حتى يقسم فكرك ويشعب ظنك الى ان لا تدرى من اين تتوصل وباى طريق معناه يتحصل

كقول الفرزدق :

وماثله فى الناس الا مملكا ابو امه حى ابوه يقاربه

او كقول ابى تمام :

ثانيه فى كبد السماء ولم يكن كاثنين ثان اذهما فى الغار

وغير المعقد هو ان يفتح صاحبه لفكرتك الطريق المستوى ويمهده وان كان فى معاطف نصب عليه المنار واوقد الانوار حتى تسلك سلوك المتبين لوجهته وتقطعه قطع الواثق بالنجح فى طيه ۔(۱/ ۱۷۵-۱۷۶)

فصاحت کی دو قسمیں ہیں: ایک کا تعلق معنی سے ہے اور وہ کلام کا تعقید سے خالی ہونا ہے اور دوسری کا تعلق لفظ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ کلمہ عربی ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ قابل وثوق فصحائے عرب کی زبان پر خوب جاری اور ان کے بکثرت استعمال میں ہو۔ غیر خالص عربیوں کا ایجاد کردہ نہ ہو، غلط العوام کی قبیل سے نہ ہو اور یہ کہ قواعد زبان کے معیار پر پورا اترتا ہو اور یہ کہ تنافر سے پاک ہو۔

اور کلام کی تعقید سے مراد یہ ہے کہ صاحب کلام تمہاری جولانی فکر کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہو اور معنی کے راستے میں کانٹے ڈال رہا ہو اور جانب معنی تمہاری روش کو دشوار گزار بنا رہا ہو تا کہ وہ تمہاری فکر کو پریشان اور گمان کو شاخ در شاخ کردے، یہاں تک کہ راہ وصول نامعلوم اور حصول معنی کا راستہ گم ہو جائے۔ جیسے فرزدق کا شعر:

وما مثله فى الناس الا مملكا ابو امه حى ابوه يقاربه

یا ابوتمام کا شعر:

ثانيه فى كبد السماء ولم يكن كاثنين ثان اذ هما فى الغار

اور کلام غیر معقد وہ ہے جو تمہاری فکر کے لیے مسطح راستہ کھول دے، اسے ہموار کردے اور اگر مقصود کہیں تہ میں ہو تو وہ اس پر کوئی نشان مقرر کردے اور

چراغاں کرے تا کہ تم اس راہ پر اس طرح چلو جیسا کہ معلوم جہت و رخ والا چلتا ہے اور اس شخص کی طرح راہ طے کرو جسے قطع مسافت کے بعد کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔

اب عبدالقاہر جرجانی (ف ۴۷۱ھ) کی دلائل الاعجاز سے وہ عبارت ملاحظہ ہو، جو سکاّکی کا ماخذ ہے لکھتے ہیں:

اذ كان النظم سويا والتاليف مستقيما ، كان وصول المعنى الى قلبك لو وصول اللفظ الى سمعك واذا كان على خلاف ما ينبغى وصل اللفظ الى السمع وبقيت فى المعنى تطلبه وتتعجب فيه واذا افرط الامر فى ذلك صار الى التعقيد الذى قالوا انه يستهلك المعنى ۔(ص۲۶۹)

جب عبارت کی ترتیب درست اور بندش چست ہو تو تمہارے کانوں تک الفاظ کے پہنچتے ہی معنی کی رسائی دل تک ہو جائے گی اور اگر موزوں و مناسب کے برعکس ہوگی تو کانوں تک الفاظ کے پہنچنے کے بعد بھی تم معنی ڈھونڈھتے اور اس میں متحیر رہ جاؤ گے اور اس باب میں جب معاملہ حد سے متجاوز ہو جائے گا تو وہ تعقید رونما ہوگی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قاتل معنی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جرجانی کی تعقید اور وضوح معنی کی یہ بحث دراصل جاحظ (۱۶۳ھ-۲۵۵ھ) سے مستفاد ہے۔ وہ البیان والتبیین میں لکھتا ہے:

وقال بعضهم : وهو من احسن ما اجتنيناه ودوناه لايكون الكلام يستحق اسم البلاغته حتى يسابق معناه لفظه ولفظه معناه فلا يكون لفظه الى سمعك اسبق من معناه الى قلبك۔ (۱/ ۱۱۵)

بعض لوگوں نے کہا ہے (اور بلاغت سے متعلق ہم نے جتنے اقوال منتخب و مرتب کیے ہیں ان میں یہ سب بہتر اور خوب صورت ہے) کہ کلام اسم بلاغت کا مستحق اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے معنی اس کے الفاظ سے اور اس کے الفاظ اس کے معنی سے

آگے نکل جائیں پس الفاظ کی تمہارے کانوں تک رسائی معنی کی دل نشینی پر سبقت حاصل نہ کر سکے)۔

ان تفصیلات کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تعقید کی اصل بحث شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ اور اس کی اساس کیا ہے؟ دراصل قدمائے عرب کا خیال تھا کہ بلاغت کلام کی منزل اول فصاحت کلام ہے اور فصاحت کلام عبارت ہے الفاظ کی خوش آہنگی اور وضاحت معنی سے۔ لہذا وہ چیزیں جو خوش آہنگی یا وضاحت معنی کی ضد ہیں وہ عیوب کلام میں داخل ہیں۔ اب تنافر ضد ہے خوش آہنگی کی اور تعقید ضد ہے وضاحت کی۔ لہذا یہ دونوں بھی عیوب کلام میں داخل ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ شوق تعقید کی تعریف میں اس کی مرکزی فکر سے ہٹ گئے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ضمنا یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فن بلاغت کے اصول وقواعد کس طرح ارتقا پذیر ہوئے ہیں؟ اور اس فن کے واضعین، اساطین، مرتبین، شارحین اور مقلدین کون ہیں؟

(ہ) متعدد اہل قلم نے تعقید کی صحیح تعریف کے باوجود تعقید لفظی کی مثال میں ایسے اشعار نقل کر دیے ہیں، جن میں بعض الفاظ کی تقدیم وتاخیر تو ہے لیکن معنوی پیچیدگی نہیں ہے۔ ممکن ہے یہی اشعار شوق اور پھر حسرت کی غلط فہمی کا باعث بنے ہوں۔ مثلاً فارسی کے یہ اشعار:

تو نیکو روش باش تابد سگال　　　به نقص تو گفتن نیابد مجال

(سعدی)

ترسم مجنون خبر ندارد　　　وانگہ دارد کہ سر ندارد

(نامعلوم)

اے آفتاب دم شب وصل از وفا مزن　　　زنہار ایں ترنج طلا را بما مزن

(محسن تاثیر)

ان میں سے مقدم الذکر شعر خان آرزو نے اور موخر الذکر دونوں اشعار وارستہ نے نقل کیے ہیں۔ اسی طرح صاحب غیاث اللغات نے

ع　چوں برانی می کنم فغان و زاری زیں درم

کو تعقید لفظی کی مثال میں پیش کیا ہے، حالانکہ معنوی پیچیدگی جو تعقید کی بنیادی شرط ہے، متذکرہ بالا

اشعار اور مصرع زیر بحث میں نہیں پائی جاتی۔

یہی کیفیت اردو کے درج ذیل اشعار کی بھی ہے:

توڑ کر مسجد بنائی تونے شیخ ! برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

اعجاز جاں دہی ہے ہمارا کلام کو زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو

بند آنکھیں کیے جاتا کدہر تو کہ تجھے ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے ان سب کو تعقید لفظی کی مثال میں نقل کیا ہے لیکن مفہوم کی وضاحت کی وجہ سے ان پر تعقید لفظی کا اطلاق درست نہیں معلوم ہوتا۔

کتابیات

۱- اردو لغت تاریخی اصول پر، جلد پنجم، کراچی ۱۹۸۳ء۔

۲- اصول بلاغت، مولانا عزیز الحق کوثر ندوی، بنارس ۱۹۸۲ء۔

۳- ایضاح التلخیص، خطیب قزوینی، مشمولہ الجزء الاول من شروح التلخیص، مصر ۱۳۴۲ھ۔

۴- ایضاح مع اصلاح وازاحۃ الاغلاط، شوق نیموی، لکھنؤ ۱۸۹۳ء۔

۵- بحر الفصاحت، حکیم نجم الغنی خاں رام پوری، نول کشور، لکھنؤ ۱۳۳۵ھ۔

۶- البلاغۃ الواضحۃ، علی الجارم، مصطفیٰ الامین، دار المعارف، بصرہ ۱۹۵۶ء۔

۷- البیان والتبیین، الجاحظ، تحقیق عبد السلام محمد ہارون، قاہرہ ۱۹۴۸ء۔

۸- تذکرۃ البلاغۃ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۳۷ء۔

۹- التعریفات، سید شریف جرجانی تحقیق ابراہیم الابیاری، بیروت ۱۹۹۸ء۔

۱۰- تلخیص المفتاح، خطیب قزوینی، مشمولہ الجزء الاول من شروح التلخیص، مصر ۱۳۴۲ھ۔

۱۱- حاشیہ مختصر المعانی، الدسوقی، مشمولہ الجزء الاول من شروح التلخیص، مصر ۱۳۴۲ھ۔

۱۲- دلائل الاعجاز، عبد القاہر الجرجانی، تعلیق محمد عبد المنعم الخفاجی، قاہرہ ۱۹۶۹ء۔

۱۳- روح انیس، سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر، لکھنؤ۔ ۱۹۶۴ء۔

۱۴- صحاح، الجوہری، دار الکتاب العربی، مصر سنہ ندارد۔

۱۵- عروس الافراح فی شرح تلخیص المفتاح، بہاء الدین السبکی، مشمولہ الجزء الاول من شروح التلخیص، مصر ۱۳۴۲ھ۔
۱۶- عروض آہنگ اور بیان، شمس الرحمان فاروقی، طبع دوم، دہلی ۲۰۰۴ء۔
۱۷- غالب کے خطوط، خلیق انجم، جلد چہارم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۳ء۔
۱۸- غیاث اللغات، غیاث الدین رام پوری، نظامی کانپور ۱۲۹۲ھ۔
۱۹- فرہنگ آنندراج، محمد پادشاہ متخلص بہ شاد، زیر نظر محمد دبیر سیاقی، جلد دوم، تہران ۱۳۳۶ خورشیدی۔
۲۰- فرہنگ بلاغی، ادبی، ابوالقاسم رادفر، تہران ۱۳۶۸ھ۔
۲۱- فرہنگ عمید، حسن عمید، چاپ اول، تہران ۲۵۳۷ شہنشاہی۔
۲۲- فرہنگ فارسی، دکتر معین، تہران ۱۳۷۱ھ۔
۲۳- فرہنگ نفیسی، علی اکبر نفیسی، تہران ۱۳۱۸-۱۳۱۹ھ۔
۲۴- فصاحت و بلاغت، مولانا عزیز الحق کوثر ندوی، بنارس ۱۹۸۵ء۔
۲۵- القاموس المحیط، فیروز آبادی، الجزء الاول، المطبعۃ الحسینیۃ المصریۃ، ۱۳۴۴ھ۔
۲۶- کشاف اصطلاحات الفنون، شیخ محمد اعلیٰ التھانوی، کلکتہ ۱۸۴۸ء
۲۷- کلیات اکبر، ترتیب نارنگ ساقی، میڈیا انٹرنیشنل، دہلی ۲۰۰۳ء۔
۲۸- کلیات مصحفی (جلد نہم، قصائد) تریب نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۹ء۔
۲۹- لغت نامہ دہخدا، علی اکبر دہخدا، جلد چہارم، دانش گاہ، تہران، بہار ۱۳۷۳ھ۔
۳۰- لغات روزمرہ، شمس الرحمان فاروقی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۲۰۰۳ء۔
۳۱- مثمر، سراج الدین علی خاں آرزو، تصحیح ریحانہ خاتون، پاکستان ۱۹۹۱ء۔
۳۲- مجمع الصنائع، نظام الدین صدیقی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۳۳- مختصر المعانی، تفتازانی، رشیدیہ، دہلی، سنہ ندارد۔
۳۴- مصباح اللغات، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مکتبہ برہان دہلی، سنہ ندارد۔
۳۵- مصطلحات الشعراء، سیال کوٹی مل وارستہ، مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۸۸ء۔
۳۶- مطلع السعدین، سیال کوٹی مل وارستہ، مطبع نول کشور کانپور، ۱۸۸۰ء۔
۳۷- المطول، تفتازانی، مطبع شاہ جہانی، بھوپال، ۱۳۱۱ھ۔

۳۸- مفتاح العلوم، سکاکی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۳۹- مفتاح العلوم، سکاکی، المطبعۃ المیمنہ، مصر ۱۳۱۸ھ۔

۴۰- منتخب اللغات، سید عبدالرشید مدنی ٹھٹوی، برحاشیہ غیاث اللغات، نظامی کانپور، ۱۲۹۲ھ۔

۴۱- منتہی الارب، عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری، تہران ۱۳۷۷ھ۔

۴۲- موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، آفسیٹ پریس لکھنؤ، ۱۹۲۴ء۔

۴۳- مواہب الفتاح شرح تلخیص المفتاح، ابن یعقوب المغربی، مشمولہ الجزء الاول من شروح التلخیص، مصر ۱۳۴۲ھ۔

۴۴- موہبت عظمیٰ، سراج الدین علی خاں آرزو، مطبع ندارد، ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء۔

۴۵- نکات سخن، حسرت موہانی، آرام باغ روڈ کراچی، سنہ ندارد۔

۴۶- نوراللغات، نورالحسن نیر کاکوروی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء۔

=/۶۵۔ =/۴۰۔ =/۸۰۔ =/۳۵۔ =/۵۰۔ =/۹۰۔ =/۴۵۔ =/۵۵۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مظلوم شاعر مرزا عباس بیگ عباسؔ

ڈاکٹر سید لطیف حسینؔ ادیب

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو شعراء سزایاب ہوئے تھے، ان میں ایک نام مرزا عباس بیگ عباسؔ کا بھی ہے۔ ان کو انگریزوں نے سزائے موت دی تھی لیکن آزادی کی لڑائی میں ان کی حصہ داری کی نوعیت اور شاعر کی حیثیت سے آزادی کی امنگ پیدا کرنے والی شاعری کے نمونے دست یاب نہیں ہیں۔ تاہم قلت معلومات کی وجہ سے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس مضمون میں دست یاب معلومات کو نظر ثانی کے بعد ایک تعارفی مضمون کی شکل میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرزا عباس بیگ عباس محلّہ قصائی ٹولہ شہر کہنہ بریلی میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدامجد ایران کے عہد قاچاری کے نامور امیر اور شاعر مرزا ذکی المتخلص بہ ندیمؔ (م ۱۷۴۱ء) تھے جو نادر شاہ کے ساتھ ایک مصاحب کی حیثیت سے اس کے ہندوستان پر حملے (نومبر ۱۷۳۸ء) کے زمانے میں آئے تھے۔ بعد کو وہ نجف چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ۱۷۴۱ء میں ہوئی۔ (عقد ثریا، ص ۱۳۴) القصہ مرزا عباس بیگ عباسؔ ایرانی النسل تھے اور ان کو صلاحیت شاعری وراثت میں ملی تھی۔ انہوں نے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ انگریزی زبان بھی سیکھی۔ انشاء نویسی میں مشہور ہوئے (انتخاب یادگار، ص ۲۱۸)، تحصیل علم کے بعد عین جوانی میں تلاش روزگار کے لیے گھر کے باہر قدم نکالا اور نواب احمد علی خاں کے عہد حکومت (م ۱۷۹۴ تا ۱۸۴۰ء) میں رام پور وارد ہوئے اور ایک مدت تک وابستہ دامن دولت رہے۔ (انتخاب یادگار، ص ۲۱۸) ان کے قیام رام پور کے

۳۷ پھول والان، بریلی، ۲۴۳۰۰۳۔

زمانے میں کسی استاذ سخن کی شاگردی اختیار کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ ان کے ہم عصروں میں امام بخش ناسخ ۱۸۳۸ء میں اور کرامت علی خاں شہیدی ۱۸۴۱ء میں فوت ہو چکے تھے۔ دیگر اساتذۂ معاصرین میں خواجہ علی آتش (۱۸۴۶ء) اور سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی (۱۸۸۰ء) حیات تھے۔ عباس نے اپنی شاعری کو جلا دینے کے لیے کسی استاذ سخن سے وابستہ ہونے کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا اور آتش کی شاگردی اختیار کی۔ عباس کو ناسخ کے کلام سے فیض یاب ہونے کا اقرار تھا اور ساتھ ہی خواجہ آتش سے استفادے کا بھی۔ ان کے ہی بقول ؎

مشاعرے میں غزل کیا چمکتی اے عباس   جو فیض آتش و ناسخ نہ کام کر جاتا

آتش نے ان کا تخلص بدل دیا۔ عباس کی جگہ نادر تجویز کیا۔ (انتخاب یادگار، ص ۲۱۸)

مرزا عباس بیگ عباس کے ادبی کام کے سلسلے میں امیر مینائی نے تحریر کیا کہ ''منجملہ تصنیفات ایک مثنوی اون کی ہے کہ فسانۂ عجائب کو مثنوی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں موزوں کیا ہے اور سنا گیا کہ دیوان بھی ترتیب دیا ہے مگر نہ دیوان کا پتا لگا نہ مثنوی کا''۔ (انتخاب یادگار، ص ۲۱۸) امداد صابری نے تحریر کیا'' آپ نے فسانۂ عجائب کو نظم کیا تھا۔ سات دیوان غیر مطبوعہ چھوڑے جو ہنگامۂ غدر میں ضائع ہو گئے۔ صرف ایک دیوان باقی رہ گیا تھا جو ان کے صاحب زادے مرزا رستم یار بیگ قیصر نے چھپوا دیا تھا''۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء، ص ۳۰۴)۔ امیر مینائی اور امداد صابری کی تحریروں سے مستفاد ہوا کہ مرزا عباس بیگ عباس نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ البتہ یہ کہا کہ انہوں نے سات دیوان غیر مطبوعہ چھوڑے، غلط اطلاع پر مبنی ہے۔ عباس نے صرف چالیس سال کی عمر پائی۔ اتنی عمر میں سات دواوین کو مرتب کرنا محض مبالغہ آرائی ہے۔ درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس کو ان کے صاحب زادے مرزا رستم یار بیگ قیصر بریلوی (م ۱۹۲۶ء) نے شائع کرا دیا۔ اب وہ بھی ناپید ہو چکا ہے۔

سید تعظیم علی نقوی بریلوی نے مرزا عباس بیگ عباس کے تلامذہ کے اسماء تحریر کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استاذ سخن تھے۔ ان کے تلامذہ کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

محمد اکرام حسین اکرام بریلوی۔ نواب محمد حسن خاں عاجز بریلوی۔ سعادت یار خاں عاشق

بریلوی۔نواب علی بہادر خاں علیؔ۔منشی غلام حسین قاصرؔ۔نواب ہادی حسن خاں ہادیؔ بریلوی۔

مالک رام کی تحقیق ہے کہ باندہ کے نواب علی بہادر خاں نے ابتداءً عباس بیگ عباس سے اصلاح لی تھی اوران کے پھانسی پانے کے بعد غالبؔ سے مشورۂ سخن کیا۔(تلامذہ غالب۔باردوم۔ص ۴۳۲)

تذکرہ شعرائے اردو میں مرزا عباس بیگ عباسؔ و نادرؔ کی غزلیات کے کچھ اشعار ملتے ہیں۔یہ اشعاران کی عشقیہ شاعری کا نمونہ ہیں۔آزادی کی امنگ پیدا کرنے والی شاعری کے نمونے دست یاب نہیں ہیں۔ان کی عشقیہ شاعری میں مضمون طرازی کے باوصف شگفتگی ملتی ہے۔ان کا یہ طرز سخن ناسخ وآتش کے اثرات شاعری کی آمیزش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جب بیعت گل کا شجرہ گل نے نکالا ۔۔۔ گیسو سے نیا سلسلہ سنبل نے نکالا

اس قامت موزوں نے کیا سرو کو سیدھا ۔۔۔ بل طرۂ شمشاد کا کاکل نے نکالا

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر مرا گلو بھی نہیں رہے گا ۔۔۔ کمر میں قاتل کی پرستمگر ہمیشہ تو بھی نہیں رہے گا

بوسہ کا نیل عارض جاناں میں رہ گیا ۔۔۔ سوسن کا پھول کھل کے گلستاں میں رہ گیا

اوروں نے جاکے مصحف رخ چوم ہی لیا ۔۔۔ میں فال دیکھتا ہوا قرآں میں رہ گیا

گیسوؤں کو وصل کی شب منہ پہ تم آنے تو دو ۔۔۔ شرط بدتا ہوں قیامت تک سحر ہوتی نہیں

بولے سن کے وہ حال میرا ۔۔۔ نادرؔ کو بھی ہوا لگی ہے

بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے ۔۔۔ لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے

پیا نہیں شراب کبھی بے وضو کیے ۔۔۔ قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے

باب قبول کہتی ہے جس کو تمام خلق ۔۔۔ کھڑکی وہ اے صنم تری دولت سرا کی ہے

عباسؔ روز حشر یہ کہتا اٹھوں گا میں ۔۔۔ لوٹا مجھے بتوں نے دہائی خدا کی ہے

دل کی شکل صنوبری ہے ۔۔۔ قمری پردہ میں بولتی ہے

ساقی ابدال ہے ولی ہے ۔۔۔ کشتی خشکی میں چل رہی ہے

مرزا عباس بیگ عباس کی دو نعتیں بھی دست یاب ہوئی ہیں۔ایک نعت کا مطلع و مقطع مندرجہ ذیل ہے ؎

قرباں نہ ہو کیوں تجھ پہ دل و جان محمدؐ ۔۔۔ کیا کیا ترا امت پہ ہے احسان محمدؐ

عباسؔ کی دن رات یہ ہے شوق وتمنا یہ آپ کے روضہ پہ ہو قربان محمدؐ

دوسری نعت مقامی طور پر مشہور ہوئی اور اس کو محافل میلاد میں پڑھا جاتا تھا۔ وہ نعت یہ ہے ؎

خدا ہے تیرا ثنا خوان یا رسول اللہ بڑی ہے سب سے تری شان یا رسول اللہ

یہ نام وہ ہے کہ ممکن نہیں ثنا جس کی کہ آپ کہتا ہے سبحان یا رسول اللہ

دل اس کا نور حقیقت سے کیوں نہ ہو روشن زباں پہ جس کی ہو ہر آن یا رسول اللہ

خدا نے اپنی عنایت سے ہے کیا نازل تمہارے واسطے قرآن یا رسول اللہ

بہ وقت گرمی خورشید حشر ہو کافی تمہارا سایۂ دیوان یا رسول اللہ

یہ عرض آپ کی خدمت میں رکھتا ہے عباسؔ دم اخیر ہو آسان یا رسول اللہ

(گلدستۂ آئینۂ مغفرت، ص ۲۵)

مرزا عباس بیگ عباس لکھنؤ سے باندہ پہنچے۔ باندہ ریاست تھی جو باجی راؤ نے نواب شمشیر بہادر اول کو عطا کی تھی۔ شمشیر بہادر باجی راؤ کی مطبوع مستانی کے بطن سے تھا۔ شمشیر بہادر پانی پت کی جنگ (۱۷۶۱ء) میں مقتول ہوا۔ بعد میں انگریزوں نے ریاست باندہ پر قبضہ کرلیا اور اس کے حکمراں نواب شمشیر بہادر ثانی (۱۸۲۳ء) کو باندہ کے قریب علاقہ دے کر وظیفہ مقرر کردیا۔ شمشیر بہادر ثانی کے پسر ذوالفقار بہادر تھے۔ ان کی ۵/اگست ۱۸۴۹ء کو وفات کے بعد نواب علی بہادر جانشین ہوئے۔ (تلامذۂ غالب، باردوم، ص ۴۲۸) ان کے عہد میں مرزا عباس بیگ عباس باندہ پہنچے اور ملازم سرکار ہوئے۔ نواب علی بہادر نے ان کا تلمذ اختیار کیا۔ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ امداد صابری کے بقول نواب علی بہادر نے ان کو وزیر اعلیٰ بنادیا ہو (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء، ص ۳۰۲)۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت نواب علی بہادر نے ریاست باندہ پر اپنی آزاد حکومت کا اعلان کردیا۔ ۱۹/اپریل ۱۸۵۹ء کو میجر جنرل وھٹلاک نے باندہ پر قبضہ کرلیا اور نواب علی بہادر کو اندور میں نظر بند کردیا۔ (تلامذۂ غالب، باردوم، ص ۴۳۰) لیکن مرزا عباس بیگ عباس کو پھانسی کی سزا دی۔ یہ روایت مشہور ہوئی کہ ان کی سزائے موت کا باعث یہ شعر تھا ؎

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

لیکن یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں جن شنیدہ اشعار کو نقل کیا ان میں یہ شعر شامل نہیں ہے (انتخاب یادگار، ص ۳۱۸) امداد صابری نے تحریر کیا کہ عباس نے ’’تختہ دار پر چڑھنے سے پہلے یہ شعر فرمایا تھا جواب تک زبان زد خاص و عام ہے اور بہت ہی مقبول عوام ہوا ہے‘‘۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء، ص ۳۰۴) دراصل یہ شعر عباس کا نہیں آغا محمد خاں ترقّی کا ہے۔

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے چرچے یہی رہیں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے

(جوش معرکہ بودیا، جلد ا ص ۲۲۰)

پھانسی کے وقت عباس کی عمر صرف چالیس سال کی تھی۔ منیر شکوہ آبادی نے تاریخ وفات تحریر کی۔

مصرعہ تاریخ گفتم اے منیّر بود ہے ہے شاعر شیریں کلام

۱۲۷۴ھ

(تاریخ نمبر نگار، رام پور، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۵۶)

عطا جائسی نے یہ قطعہ تاریخ قلم بند کیا۔

ز سر بگذشت نگذشت ازسر دیں تعالی اللہ چہ دولتے یافت عبّاس
چو پرسیدند تاریخش عطّا گفت زسر دادن شہادتے یافت عبّاس

۱۳۴۴ھ

(تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ، ج ۲ ص ۱۱۸۴)

۱۳۴۴ میں سے سرِعباس یعنی ع کے ۷۰ اعداد کی تخرجیج سے ۱۲۷۴ برآمد ہوتے ہیں جو سال شہادت ہے۔ مرزا عباس بیگ عباس کو ایک مثال سمجھنا چاہیے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے کتنے ہی مظلوم شعراء مناسب تعارف کے ہنوز محتاج ہیں۔

کتابیات

انتخاب یادگار۔ امیر مینائی، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی اڈیشن، وجیتا آفسٹ پرنٹرس

دہلی ۔ ۱۹۸۲ء۔
آئینۂ مغفرت (گلدستۂ نعت)۔مرتب سید حسین شاہ شمیم بریلوی۔ مطبع گلشن فیض لکھنؤ۔ ۱۸۹۸ء
تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ۔ج ۲،سید تعظیم علی نقوی بریلوی ثم کراچی۔مسودے کی عکسی نقل۔
تلامذۂ غالب۔مالک رام۔باردوم۔لبرٹی آرٹ پریس۔مئی ۱۹۸۴ء۔
خوش معرکۂ زیبا۔ناصر نگینوی۔ج ۱،مرتب مشفق خواجہ۔مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۷۰ء۔
۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء۔امداد صابری۔مکتبہ شاہراہ۔اردو بازار دہلی۔ ۱۹۵۹ء۔
شمیم سخن۔محمد عبدالحیٔ صفا بدایونی۔مطبع امداد الہند مراد آباد۔ ۱۸۸۴ء۔مخزونہ رام پور رضا لائبریری رام پور۔کال نمبر ۶۴۔
عقد ثریا۔غلام ہمدانی مصحفی۔مرتب عبدالحق۔انجمن ترقی اردو۔اورنگ آباد دکن۔ ۱۹۳۴ء۔
نگار رام پور (ماہنامہ) تاریخ نمبر۔مدیر اکبر علی خاں عرشی زادہ۔نام مطبع ندارد۔جولائی ۱۹۶۳ء۔

پہلا صلیبی سامراج - چند فراموش شدہ تاریخی حقیقتیں

جناب عبدالمتین منیری

جب کوئی مورخ پندرہویں صدی کے پرتگالی کھوجی ٹیموں کے بحری انکشافات اوران کے اسفار کے موضوع کو چھیڑتا ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان کے پیچھے کارفرما محرکات کا بھی پتہ لگائے۔ اس نقطہ نظر سے پوری صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ بنیادی مقصد عہد وسطی کے عالمی تجارتی راستوں پر مکمل دسترس حاصل کرنا اور ان کے سرچشموں کو مسلمانوں کی سرزمینوں سے کاٹ کر پرتگال کی سرزمین کی طرف موڑنا اور پھر یہاں سے یورپ تک انہیں لے جانا تھا، اس کی وضاحت کے لیے اس وقت کے عالمی تجارت کے راستوں کو پیش کرنا از حد ضروری ہے۔

دور وسطی میں سامان تجارت کے اصلی راستے براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل سے شروع ہو کر ملیشیا اور چین تک پہنچتے تھے، یہ تجارت مختلف بری اور بحری راستوں سے ہو کر گزرتی تھی اور یہ زیادہ تر بحر ہند سے ہوتے ہوئے بحر اوقیانوس پر ختم ہوتی تھی، ان کے درمیان میں عالم عرب اور یورپ کی منڈیاں آتی تھیں، اس تجارت میں مندرجہ ذیل گزرگاہیں نمایاں ہیں۔

خلیج عرب۔ملک شام: مشرقی سامان تجارت کشتیوں کے راستے ہندوستان سے خلیج عرب (فارس) تک پہنچتا، پھر بصرہ اور خلیج کے آخری سرے تک، جہاں سے تجارتی قافلے بری راستوں یا پھر نہر فرات کے ذریعہ بغداد پہنچتے، یہاں سے حلب اور پھر وہاں سے مغرب کی سمت پر واقع شامی بندرگاہوں تک پہنچتے جہاں وینس اور جنوہ کی کشتیاں یورپ کی منڈیوں میں انہیں پہنچانے کے انتظار میں تیار رہتیں۔(۱)

ammuniri@gmail.com بھٹکل۔

اس راستے کو طریق اوسط (درمیانی راستہ) کہا جاتا تھا۔ یورپی صارفین تک ہندوستانی ومشرقی سامان پہنچانے کے لیے یہ راستہ سب سے اچھا تھا، اپنے بہترین جغرافیائی محل وقوع اور وہاں تک ہندوستانی کشتیوں کی براہ راست رسائی کی وجہ سے اس راستے سے اطالوی شہروں نے مشرقی عرب ملکوں میں برپا صلیبی جنگوں کے دوران خوب فائدہ اٹھایا۔

بحراحمر۔مصر: یہ راستہ عدن کے جنوب میں واقع مشرق سے آنے والے سامان تجارت اکٹھا ہونے کے مرکز سے شروع ہوتا تھا، پھر یہ سامان بحری راستہ سے بحراحمر کے مغربی ساحل پر سویزیا (عیذاب اور قیصر) لے جایا جاتا، وہاں سے قاہرہ پھر اسکندریہ اور کبھی دمیاط لے جایا جاتا، جہاں سے وینس اور جنوہ کی کشتیاں اسے یورپ منتقل کرتیں وہاں یہ صارفین کے لیے خردہ فروشوں کے پاس پہنچتا۔ (۲)

جب مملوک سلاطین مصر، شام، حجاز اور یمن کے بعض علاقوں پر عہد وسطی کے اواخر سے عہد جدید کے آغاز تک (۱۲۵۰ء - ۱۵۱۷ء) حکومت کرنے لگے اور یہ دونوں راستے ممالیک کے قبضے میں آگئے تو انہوں نے اپنی سرزمین سے گذرنے والے سامان تجارت پر مختلف قسم کے زبردست ٹیکس لگاکر بے تحاشہ منافع کمانا شروع کیا۔ (۳)

ان ممالیک سلاطین کی کوشش رہی کہ فائدہ مند مصالحہ جات کی تجارت کے راز اپنے تک محدود رکھیں، کوئی اور قوم اس تجارت کے خفیہ رازوں سے آگاہ نہ ہو، لہذا انہوں نے اس کے لیے زبردست احتیاطی تدابیر اختیار کیں، اس غرض سے انہوں نے غیر مسلم سوار کشتیوں کے بحراحمر کی سے گذرنے پر اس دلیل کے ساتھ پابندی لگادی کہ یہ سمندر حجاز کے مقدس اسلامی مقامات تک جاتا ہے، لہذا انہوں نے یہ حصار توڑنے یا مشرقی تجارت کی اصل جگہوں اور راستوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کیں۔ (۴)

(بحراحمر میں جہاز رانی کا یہ ضابطہ دراصل صلاح الدین ایوبیؒ نے فرانسیسی بادشاہ ارناط ف ۱۱۸۷ء Renaud de Chatillon کے بحراحمر پر حملہ کے بعد نافذ کیا تھا)

ان دونوں راستوں سے جو کہ مصالحہ جات کی تجارت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے

تھے ہٹ کر ایک تیسرا بری راستہ بھی تھا جو خطرات سے پر تھا، یہ ملیبار کے اندرونی پہاڑوں سے نکل کر شمال کی طرف کو بڑھتا اور مختلف آڑھے ٹیڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے دریائے جیحون کی طرف نکلتا جہاں چین و بخارا سے آنے والے راستے اس سے مل جاتے تھے۔ یہاں سے اس کی دوشاخیں ہو جاتی تھیں۔ پہلا صلیبی سامراج......

ایک بحر قزوین سے ہوتے ہوئے دریائے وولگا کی طرف نکلتی۔ دوسری بحر اسود کی طرف جاتی جو طرابزون پھر قسطنطنیہ تک پہنچتی۔

چودہویں صدی کے اواخر اور پندرہویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کی توسیعی جنگوں کے ظہور پذیر ہونے کی وجہ سے اس راستے میں زبردست رکاوٹیں آئیں۔ (۵)

متنازع گروپوں میں اختلافات اور سیاسی تنازعات کی وجہ سے ان عربی و اسلامی علاقوں سے گذرنے والے دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ یا دونوں بند ہوتا رہتا، جس کی وجہ سے یورپ کو مشرقی ایشیا کی رسد بند ہو جاتی اور تاجروں کو اس تیسرے راستے کو اپنانے کی ضرورت پیش آتی حالانکہ ایشیا کے وسیع و عریض خطے پر پھیلے ہونے کی وجہ سے یہ راستہ بھی چنداں محفوظ نہ ہوتا۔ (۶)

قرون وسطی کے آخری حصے میں یہ اہم پیش رفت ہوئی کہ مصالحہ جات تیار کرنے والے تمام مراکز اور راستے مسلمانوں کے ہاتھوں میں آ گئے اور ان علاقوں کے روابط ہندوستان کی مقامی اسلامی حکومتوں جیسے افغان اور مغل کے ساتھ، ملقا کی مسلم سلطنتوں کے ساتھ، مصر، شام اور حجاز کے مملوک سلاطین کے ساتھ اور مشرقی افریقہ کی اسلامی امارتوں کے ساتھ مضبوط ہو گئے اور یورپ مسلم تجارت کے مکمل کنٹرول سے نکلنے کے اسباب و وسائل کے حصول کی جد و جہد میں مشغول ہو گیا اور اس بات کی ضرورت اس وقت شدید تر ہو گئی جب مسلم عثمانی سلطنت نے اناطول کو فتح کیا اور ۱۴۵۳ء میں مشرقی یورپ کے پایۂ تخت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس میں شک نہیں کہ مشرقی یورپ پر عثمانیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے پاپائے روم کو ازسرنو مسلمانوں کے خلاف دوسری صلیبی جنگ شروع کرنے کی صدا دینے پر اکسایا۔ (۷)

بعض مورخین کی رائے ہے کہ دور جدید کی ابتدا میں جو جغرافیائی کھوجی ٹیمیں نکلیں ان کا

اولین مقصد عثمانی ترکوں کی ایشیائے کوچک اور بحر متوسط کے مشرقی ساحلوں کی طرف پیش قدمی کو روکنا اور انہیں ہندوستان کو مغرب سے ملانے والے قدیم تجارتی راستوں سے کاٹنا اور مشرق سے مصالحہ جات کے حصول کے لیے درپیش مشکلات کا حل تلاش کرنا تھا۔ یہاں سے اس سامان تجارت کی اصل جگہوں تک نئے راستوں سے پہنچنے کی انہیں سخت ضرورت پیش آئی لیکن فرانسیسی مورخ رولان موسینیہ اس رائے کو رد کرتے ہیں اور یہ استدلال کرتے ہیں کہ ترکوں کی جنگوں کی وجہ سے تجارت میں کبھی کبھار رکاوٹیں ضرور آتی تھیں لیکن ترکوں نے بذات خود کبھی مغرب والوں سے تجارتی معاملات میں دشمنی کا رویہ نہیں اپنایا، انہوں نے ہمیشہ وینس اور جنوہ کی حکومتوں کے ساتھ معاہدوں پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور ان کی تجدید اور مابین الملکی معاہدوں کی پاس داری کرتے رہے، انہوں نے فارس سے گزرنے والے قافلوں اور خلیج عرب اور بحر احمر کے بحری گزرگاہوں کی آزادی کے تحفظ کا ہمیشہ خیال رکھا، سلیم اول نے ۱۵۱۷ء میں مصر فتح کرتے ہی مملوک سلاطین کے ساتھ وینس والوں کے معاہدوں کی تجدید کی اور ممالیک نے مصالحہ جات کی تجارت پر جو ٹیکس بڑھائے تھے انہیں کم کیا۔(۸)

یہ ضرور ہے کہ عثمانی ترکوں کی یورپ میں پیش قدمی نے اس وقت نفسیاتی طور پر اہم کردار ادا کیا، جب دوبارہ اسلام مشرقی یورپ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوگیا، حالانکہ ۱۴۵۳ء میں اندلس میں یورپ کے جنوبی اور مغربی اطراف میں اسلام ختم ہو رہا تھا، اس نفسیاتی صورت حال کو عثمانی سلطان محمد الفاتح کے مشرقی آرتھوڈکس کلیسا کے مرکز قسطنطنیہ کو عثمانی سلطنت کا دارالخلافہ بنانے اور اس کا نام تبدیل کر کے دارالاسلام (اسلامبول) رکھنے نے اور تقویت دی۔(۹)

اس موقع کو پوپ کالیکٹس سوم ۵۸-۱۴۵۵ Calixtus III نے اسلام مخالف جذبات ابھارنے کے لیے استعمال کیا، اس نے سقوط قسطنطنیہ کے بعد نصرانی مذہب میں ایک نئی عبادت کی بنیاد ڈالی اور عیسائیوں کو اس کی ادائیگی کا حکم دیا، اس نے اسے نماز خوش خبری کا نام دیا، اس دوران عثمانی ترکوں کے خلاف نصرت کی دعا مانگی جاتی تھی، اس پوپ نے یورپ کو مسلمانوں کے خلاف ہر جگہ اکٹھا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔(۱۰)

ان سب اسباب سے نئی اسلامی پیش قدمی کے بارے میں تمام نصرانی دنیا ایک ڈر اور

خوف میں مبتلا ہوگئی، رومن کیتھولک چرچ نے قسطنطنیہ اور وہاں کے مشرقی کلیسا کے سقوط کے بعد اس ڈر کو مغربی اور مشرقی عیسائی دنیا پر اپنی روحانی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے خوب استعمال کیا اور مشرقی اور مغربی کلیسا کے درمیان جو دشمنی ۱۰۵۴ء کے بعد ختم نہیں ہوئی تھی وہ ان کے درمیان مکمل قطع تعلق پر منتج ہوئی۔ یہاں سے رومن کلیسا کے اندلس کے نصرانی بادشاہوں سے جذباتی تعلقات ابھرنے لگے جنھوں نے اپنے کندھوں پر دوسری صلیبی جنگ چھیڑنے کی ذمہ داری اٹھالی تھی اور شاید یہ تعبیر درست ہو کہ انھوں نے کلیسا اور اس کے پاپاؤں کے آشیرواد سے جزیرہ نمائے اسپیریا سے اسلامی وجود کو ختم کرنے اور مغربی یورپ سے اسلام اور اس کی سلطنت کو نیست و نابود کر کے پوری نصرانی دنیا پر رومن کلیسا کی سیاسی اور روحانی چودھراہٹ مسلط کرنے کا ٹھیکہ لے لیا، اسی وجہ سے رومن کلیسا اور اس کے پاپاؤں نے پرتگال اور اسپین کے متبادل تجارتی راستوں تک رسائی حاصل کر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں میں گھس کر ضرب لگانے، انھیں ان کے ملکوں کے پیچھے سے گھیر کر ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے اور تجارتی دولت کو ان سے چھین لینے اور اس طرح اقتصادی عامل (مصالحہ جات کے اصل مراکز تک براہ راست پہنچ کر ان کے اونچے ٹیکسوں سے بچنے) اور دینی عامل یہ کہ یورپ کی جغرافیائی کھوجی دستوں کی تحریک کے ذریعے (مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرنے اور عالم اسلام کو تباہ کرنے) کی کوششوں کی بھرپور ہمت افزائی کی۔

جغرافیائی تفتیشی دستے بھیجنے کے اسباب: یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ اسباب کیا تھے جو یورپ کے کھوجی دستوں کو ان علاقوں تک لے آئے جن کے بارے میں مشرق والوں کو تو پہلے سے آگاہی تھی لیکن نئی دنیا ان سے ناواقف تھی، اس سلسلے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یورپ کے عہد وسطی اور نئے دور کے آغاز کے کسی محقق کے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ مذہب کو سیاست کے جملہ گوشوں سے الگ رکھا جائے کیونکہ اس وقت مذہب ہی تمام کاموں اور سیاسی سرگرمیوں کی رہنمائی کرنے والا اور ان میں رنگ بھرنے والا تھا، کلیسا ہر معاملے میں مداخلت کرتا تھا، یہاں تک کہ زندگی کے روزمرہ کاموں میں بھی مذہب کا عمل دخل تھا، یورپ میں جغرافیائی تلاش کی تحریک اس وقت اٹھی جب سیاسی اتھارٹی اور مذہبی اتھارٹی یورپ میں ایک سکے کے دورخ کی

حیثیت رکھتے تھے، اس کے اسباب مندرجہ ذیل طور پر بیان کیے جاسکتے ہیں:

انجیل: رولان موسینیہ نے ہسپانوی اور پرتگالی کھوجی دستوں کے پیچھے کارفرما تین چیزوں (انجیل، عظمت، سونا) میں سے (انجیل) کو اولین محرک قرار دیا ہے کیونکہ صلیبی جنگوں نے اس کے مطابق۔ یورپ کے عیسائیوں کو عیسائی مذہب کے ذریعہ پھیلانے اور اسے نہ ماننے والوں کو فنا کرنے اور دبانے کا عادی بنادیا تھا۔(۱۱)

سونا: رولان موسینیہ نے ترتیب میں دوسری جگہ پر انجیل کے ساتھ سونے کو بھی اولین محرک قرار دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ دولت کے لیے یہ کوشش بڑی بنیادی کھوجوں اور تلوار کی نوک پر قائم وسیع وعریض سلطنتوں کے قیام کی اصل وجہ تھی اور سونا یورپ والوں کی بنیادی پسندیدہ چیز تھی، یہاں تک کہ ان کے سونے کی حرص کے سامنے دوسری اور ہوس ناکیاں بجھ سی گئیں تھیں۔(۱۲)

افریقہ اور ایشیا میں عیسائیوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں کے خلاف یلغار:

دور وسطی میں صلیبی جنگوں کے دوران قشطالہ اور ارگون کی قیادت میں اسپین سے اور پرتگال کی آزاد حکومت کے قیام کے بعد ان علاقوں سے اور جزیرہ نمائے ایبیر یا سے مسلمانوں کو نکال باہر پھینکنے کا جو جذبہ پروان چڑھا تھا اسے روبہ عمل لانے کی تمنا(۱۳) اسپانوی کیتھولک ملکہ ایزابیلا کی اس وصیت سے اخذ کرتے تھے، جس میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اسپین اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا جب تک افریقہ فتح نہ ہو اور ہمارے بچے نصرانی عقیدے کے لیے جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

اسپین سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے لڑی جانے والی ان جنگوں نے جو بعد میں افریقہ کے مسلمانوں کا پیچھا کرنے اور انہیں بھگانے کے مقصد سے ہونے لگی تھیں، مقدس جنگوں کا روپ دھارلیا، جب کہ کلیسا کے پاپاؤں نے یورپ کی نصرانی دنیا پر اپنا دینی و دنیوی تسلط قائم کرنے کے لیے اسے ایک سنہرا موقع جانا، اس سے زمین دار طبقہ کی کلیسا اور پاپاؤں کی دشمنی سے بھی نجات ملی، جب کہ انہیں ان جنگوں میں شریک کیا گیا اور انہیں دوران جنگ قتل ہونے پر گناہوں کی معافی کا بھی وعدہ وغیرہ کئی ایک روحانی اور مادی مراعات سے کلیسا نے نوازا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ جغرافیائی تفتیشی جماعتیں ایشیا اور نئی دنیا کی غیر معروف جگہوں تک پہنچنے

لگیں۔(۱۴)

یورپ کا سنگین معاشی بحران: چودھویں صدی دم گھٹا دینے والے بحرانوں کی صدی ہونے کی حیثیت سے یورپ کے جغرافیائی کھوجی ٹیموں کو آگے بڑھانے کا سبب بنی، ان بحرانوں نے یورپ کو چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور درپیش مشکلات کے حل کی تلاش پر مجبور کیا، ان میں اہم ترین بحران دو تھے۔

الف: کالے طاعون کی وبا (۴۸-۱۳۴۹ء) جو صرف تین سالوں کے اندر آدھے یورپ کو کھا گئی، اس کے نتیجہ میں اس براعظم کی آبادی پندرہویں صدی میں ۱۳۳۰ء کے بالمقابل ساٹھ فیصد ہوکر رہ گئی تھی۔(۱۵) اس کی وجہ سے یورپ کی مملکتیں اور خاص طور پر جزیرہ نمائے ایبیریا جس نے مسلمانوں کے اخراج کی کارروائی کرکے اپنے علاقہ جات کو وسیع کردیا تھا، اسے کاریگروں اور مزدوروں کی شدید قلت ہونے لگی، یہاں سے شمالی اور مغربی افریقہ پر حملے اور غلاموں کو درآمد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے بعد پرتگال کی آبادی ۱۴۵۰ء میں کہیں جاکر دس لاکھ ہو پائی۔(۱۶)

ب: نقد ریزگاری کا بحران: چودہویں صدی میں یورپ کرنسی کے معاملے میں دو طرح سے منقسم تھا، وسطی اور شمالی یورپ کا دارومدار چاندی پر تھا، کیونکہ وسط یورپ کی کانوں میں اس کی بہتات تھی اور جنوبی یورپ سوڈان سے آنے والے سونے پر بھروسہ کرتا تھا جو افریقہ کے مغربی عرب ممالک کے ساحلوں سے حاصل کیا جاتا تھا، اس زمانے میں مغرب عربی سونے کو مقدس دھات سمجھنے والے جنوبی یورپ اور سوڈان کے مغربی علاقوں اور جنوبی سوڈان کے جنگلاتی علاقوں کے درمیان دلال کی حیثیت رکھتا تھا، تیرہویں صدی کے آغاز میں اطالوی، فرانسیسی اور پرتگالی تاجروں کی مغرب عربی کے ساحلوں پر آمدورفت شروع ہوئی (اس دوران تونس میں سونے کی تجارت نے ترقی کی جو کہ اندلس کے اسلامی ملکوں کے علاوہ ۲۰ تا ۶۰ ہزار دینار سالانہ کا سونا یورپ کو فراہم کرتا تھا) لیکن بعد کی صدیوں میں مغرب عربی یورپ کی سونے کی اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہوگیا کیونکہ وہ خود متعدد سیاسی اور اقتصادی مشکلات کا شکار ہوگیا، لہذا جنوبی یورپ چودہویں صدی میں ریزگاری کے قحط سے دوچار ہوگیا، اس سے قبل ایسا کبھی نہیں

ہوا تھا، اس لیے یہ ضرورت اسے افریقہ کے نامعلوم سونے کی کانوں کے علاقوں تک کھینچ لائی تاکہ بغیر وساطت کے براہ راست اس کا حصول ممکن ہو، یہیں سے ابتدائی پرتگالی کھوجی سیاح مغربی افریقہ میں سونے کی نہر پائے جانے کی بات کرنے لگے اور جب افریقی براعظم کے مغربی علاقے میں سونا نکالنے اور انہیں برآمد کرنے والی جگہوں پر پہنچ گئے تو اسے سونے کے ساحل کا نام دیا۔(۱۷)

کسٹم ڈیوٹی اور تجارتی دلالوں سے نجات کی خواہش: یورپ کی حکومتوں اور صنعتی سرمایہ داروں کا، عہد جدید کے آغاز اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہی میں مسلم بندرگاہوں پر لگنے والے بھاری کسٹم اور مختلف ٹیکسوں سے نجات ایک اہم ہدف رہا تھا، جس کی وجہ سے جنوہ اور وینس کے علاوہ دوسری جگہوں کے تاجروں اور سرمایہ داروں کو مشرقی تجارت کے اصل سرچشموں کی تلاش اور اس کے ذریعہ براہ راست منافع کے لیے ہمت افزائی ہوئی۔(۱۸)

پاپاؤں نے اسپین اور پرتگال کے حکمرانوں کی اس پہلو سے ہمت افزائی کی اور ان کے جذبات کا استحصال کیا اور یہ بانگ دہل کہنے لگے کہ عالم اسلام کو کمزور کرنے اور بالآخر اس کی شکست کے لیے مشرقی تجارتی راستے کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکال کر انہیں بڑے منافع سے محروم کرنا ضروری ہے (پاپاؤں نے اسلام کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کی شدت میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ اسلام کو طاعون کا نام دیا اور نئے منکشف ہونے والے افریقہ کے علاقوں کو عیسائی بنا کر اسلام کے طاعون سے انہیں بچانے کا مطالبہ کیا)

یہ جذبہ خصوصیت سے ہم مشرق اسلامی کے علاقوں کو فتح کرتے وقت پرتگالی جرنیلوں مثلاً البوقرق وغیرہ میں دیکھتے ہیں جب اس نے ملقا میں اسلامی سلطنت پر یلغار کے وقت کہا تھا کہ عربوں کو مصالحہ جات کی تجارت سے دور کرنے کو ہم پرتگالی اسلام کو کمزور کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔(۱۹)

عیسائی عقیدے کی نشر و اشاعت: بیزنطینی کلیسا نے اسلام کے خلاف اور خصوصاً رسول اکرم ﷺ کے بارے میں معاندانہ افکار و خیالات کو پھیلایا، یہاں سے مشرقی اور مغربی یورپ کو بیزنطینی طرز کی اسلام دشمنی پر مبنی مذہبی اور کلامی کتابیں ملیں، لہذا قرون وسطی میں یورپ

کے ذہنوں پر اسلام کے خلاف بڑا واضح موقف حاوی رہا اور یورپ کے مذہبی طبقہ نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنی شروع کردی کہ خدا سے قربت چاہتے ہوتو اپنے مذہبی بھائیوں کا دائرہ وسیع کرو، خاص طور پرانہیں مسلم علاقوں میں عیسائیت پھیلانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینی ہوگی اور عرب مسلمانوں کو عیسائیت کے دائرے میں لانا ہوگا، جنہیں وہ مشرقی نصرانیوں کی دیکھادیکھی کافر اور زندیق کہا کرتے تھے۔

اس پر مستزاد یہ کہ صلیبی جنگوں کے دوران یورپ میں یہ خیالی داستان عام ہوگئی تھی کہ چین اور افریقہ کے درمیان عالم اسلام کے قلب میں ایک عظیم عیسائی سلطنت پائی جاتی ہے، ابتدا میں پرتگالی کھوجیوں نے اس سلطنت تک پہنچ کر اس کے ساتھ معاہدہ کرکے عالم اسلام کو ضرب پہنچانے اور اس کے اطراف واکناف میں عیسائی مذہب پھیلانے کی کوششیں بھی کیں، ان کا خیال تھا کہ اس سلطنت کو ایک نصرانی ولی سینٹ جون Prester John چلاتا ہے۔(۲۰)

(نوٹ: مملکت پرسٹر جون: بارہویں صدی میں سینٹ یوحنا (پرسٹر جون) کی داستان یورپ میں پھیلی، اس ادبی داستان کا احاطہ انگریزی سیاح جون مینڈول نے چودہویں صدی کے اواسط میں حقیقت واقعہ کی حیثیت سے اپنی کہانیوں میں کیا اور یہ اعتقاد کیا جانے لگا کہ بت پرست قوموں کے درمیان یہ بادشاہ موجود ہے اور یہ مشرق کی ایک بڑی عیسائی سلطنت چلاتا ہے جس کے ماتحت ہندوستان چین اور حبشہ کی سلطنتیں ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی مزید کئی اور سلطنتوں پر حکومت کرتا ہے، اس کا لقب صاحب مملکت مصالحہ جات ہے، اس سلطنت کی کھوج اور باجبروت وذی شان بادشاہ سے معاہدے کی صورت میں مغربی ایشیا اور اراضی مقدسہ فلسطین پر مسلمانوں کی سرداری ختم کی جاسکتی ہے، یہ داستانیں یورپ میں صلیبی جنگوں کے اختتام پر اس وقت پھیلیں جب عیسائی دنیا مسلمانوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار تھی اور اس کی عظمت کے خواب چکنا چور ہورہے تھے، اس طرح عیسائیوں کو ہمت دلانا، انہیں پرامید رکھنا اور ان کے جذبات کو زندہ رکھنا مقصود تھا تاکہ مسلمانوں سے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ پڑنے پائے، چونکہ یورپ والے حبشہ کو ہندوستانی سرزمین کا حصہ سمجھتے تھے تو پریسٹر جون کی گتھی تب اور الجھ گئی جب ۱۲۰۳ء میں بعض

اطالوی راہبوں کو حبشہ کے ایک راہب کے ذریعے سے یہ معلومات پہنچیں کہ حبشہ کا بادشاہ ہی دراصل پرسٹر جون ہے، یہاں سے اس مملکت کی افریقہ اور ہندوستان میں تلاش، یورپ کے جغرافیائی کھوجیوں سے وابستہ ہوگئی اور اس کے مذہبی اسباب میں سے ایک ہوگئی)۔(۲۱)

نامعلوم کی تلاش اور زیادہ سے زیادہ جغرافیائی معلومات حاصل کرنے کی خواہش:

نامعلوم سے مراد جادو بھری وہ پرکشش مشرقی دنیا تھی جس کی دولت وثروت کی داستانیں اور وہاں کی زندگی کی رعنائیوں کی خبریں ان طویل سفرناموں کے ذریعے ملتی تھیں جو تیرہویں اور چودہویں صدی کے یورپی مہم جو زبانی طور پر سینہ بہ سینہ بیان کرتے تھے یا اپنی کتابوں میں نقل کرتے تھے، ان کی تصویرکشی یورپ کے لوگوں کو مشرقی علاقوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی کی خواہش اور لالچ کو بھڑکاتی تھی، خاص طور پر اطالوی سیاح مارکوپولو ۱۲۹۹ء نے اپنے سترہ سالہ چین وایشیا کی سیاحت کے بعد اپنی کتابوں میں دی ہوئی معلومات کے بعد یورپ میں ایک فکری انقلاب پیدا کیا، جیسا کہ مورخ فیشر کا کہنا ہے کہ یہ سفرنامہ اپنی اہمیت، اثر اور حیرت انگیزی میں پندرہویں صدی میں کولمبس کے ہاتھوں براعظم امریکہ کی کھوج سے کم نہیں تھا۔(۲۲)

اس کا مزید کہنا ہے کہ ۱۴۲۸ء میں ڈوم بدرو نے وینس سے سفرنامہ مارکوپولو خرید کر اپنے بھائی ہنری ملاح کو لسبن بھیجا، یقیناً اس نے مشرق کی دولت کے سرچشموں تک پہنچنے کے لیے پرتگالی کھوج کا جو خاکہ تیار کیا تھا، اس کی تیاری میں اس کتاب سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ جغرافیائی کھوج جنوہ وغیرہ کے بجائے جن کا یہ خاص میدان تھا، پرتگال کے ورثہ میں کیوں کر آئی جو کہ اپنی وسعت اور آبادی میں بحر اوقیانوس کے ساحل پر ایک چھوٹی سی سلطنت تھی اور یہ جغرافیائی کھوج کے ایام میں اپنے ہدف تک غیر متوقع طور پر ایسی تیز رفتاری سے پہنچ گئی جس نے پورے یورپ کو بھونچکا کر دیا۔

حوالہ جات

(۱) Boies Penrose: Travel And Discovery in Renaissance (1402-1692), U.K,

1960, P,16,17.

(۲) نعیم ذکی فہمی: طرق التجارۃ الدولیۃ (القاہرہ ۱۹۷۳)، ص ۱۲۴۔ (۳) سعید عبدالفتاح عاشور: مصر فی عہد دولۃ سلاطین الممالیک البحریۃ (القاہر ۱۹۶۲ء)، ص ۲۰۸۔ (۴) شوقی الجمل: تاریخ کشف افریقیا واستعمارہا (القاہرہ ۱۹۷۱)، ص ۶۰۔ (۵) اسماعیل نور الربیعی: المرحلۃ المرحلۃ الثانیۃ من التنافس (مجلۃ الوثیقہ، ع ۲۹، س ۱۵، البحرین ۱۹۹۶)، ص ۸۹۔ (۶) ج ج لویمر: دلیل الخلیج (القسم التاریخی۔ الدوحۃ ۱۹۶۷)، ج ۱، ص ۹۔ (۷) سعید عبدالفتاح عاشور: الحرکۃ الصلیبیۃ (القاہرہ ۱۹۹۰)، ج ۲، ص ۹۸۹۔ (۸) رولان موسینیہ: تاریخ الحضارات العام (لبنان ۱۹۸۷)، ج ۴، ص ۳۹۔ (۹) عبدالعزیز الشناوی: المراحل الاولی للوجود البرتغالی (قطر ۱۹۷۶)، ج ۲، ص ۶۱۸۔ (۱۰) حمۃ الصیر فی: النفوذ البرتغالی فی الخلیج العربی (الریاض ۱۹۸۳)، ص ۷۰۔ (۱۱) رولان موسینیہ: تاریخ الحضارات العام۔ القرنان ۱۶-۱۷ (لبنان ۱۹۸۷)، ص ۴۲۴۔ (۱۲) رولان موسینیہ: تاریخ الحضارات العام۔ القرنان ۱۶-۱۷ (لبنان ۱۹۸۷)، ص ۴۲۶۔ (۱۳) عبدالملک عودہ: السیاسۃ والحکم فی افریقیا (مصر ۱۹۵۹)، ص ۶۰۔ (۱۴) جوزیف نسیم یوسف: فی تاریخ الحرکۃ الصلیبیہ (مصر ۱۹۸۹)، ص ۴۴۔

(۱۵) Boies Penrose, p 15۔

(۱۶) The Portuguese Seaborne Empire, p 4۔

(۱۷) Boies Penrose, p 13۔

(۱۸) Serjeant, R.B: The Protugese of The South Arabian Coast (London 1966), p 2

(۱۹) Danverrs: Protuguese in India (London 1966), v.2, p 226۔

(۲۰) Britanica (London 1962), 18, 458, 460۔

(۲۱) Boies Penrose, p 12. 13

سونیا۔ ی۔ ہاو: فی طلب التوابل، ترجمہ محمد عزیز رفعت (القاہرہ ۱۹۵۷)، ص ۶۴۔ ۶۸۔

اردو لغت نویسی کی روایت میں تاریخی شعور؛ فرہنگِ آصفیہ کا مطالعہ

حافظ محمد بلال اعجاز

اسلامی علمی روایت میں علم تاریخ کے ساتھ اعتنا دیگر اقوام و ملل کے مقابلے میں خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ آخری محفوظ صحیفہ ہدایت قرآن کریم میں مذکور قصص کے پہلو بہ پہلو اسوہ رسول اکرم ﷺ کو محفوظ بنانے کے لیے وضع کیے جانے والے علوم نے مسلمانوں کے تاریخی شعور کو اور مہمیز کیا، یوں ماضی و حال اور مستقبل کا گہرا شعور مسلمانوں کے ہاں نشو و ارتقاء کی منازل طے پانے والے علوم و فنون کے ہر ہر گوشے تک پہنچا۔ اس حوالے سے اگر ہم دیگر علوم و فنون سے قطع نظر صرف خالص ادبی و لسانی تناظر میں نمو پانے والے علوم کا جائزہ لیں تو ان میں بھی تاریخی شعور کا احساس بھرپور طور پر نظر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ:

> ''میں جہاں تک خیال کرتا ہوں عہد حاضر سے پہلے کسی ملک اور قوم نے تاریخ کو تدریسی مضمون قرار نہیں دیا تھا بلکہ ہمیشہ اس فن کا شمار ان فنون میں ہوتا تھا جن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کافی سمجھا جاتا تھا، صرف مسلمانوں نے اپنے عہد میں تاریخ کے اس حصہ کو جس کا تعلق نبوت و عہد صحابہ سے تھا چونکہ دین کی بنیاد اس پر قائم تھی اس لیے حدیث و سیر کے نام سے ایک خاص فن مرتب کر کے انہوں نے درس میں داخل کیا''۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ مشہور عربی نثر نگار اور لغت کے ماہر جاحظ کی کتاب البیان والتبیین (۲) جہاں زبان و بیان کی گتھیاں سلجھاتی ہے وہیں تاریخ اسلام کے بہت سے واقعات بھی ہمارے

لیکچرار گورنمنٹ کالج، راجن پور، پنجاب، پاکستان۔

سامنے لاتی ہے۔اسی طرح ابن قتیبہ کی المعارف (۳) اور مبرد کی الکامل فی الادب (۴) لغوی رموز و نکات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی بھی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔اس طرح مسلمانوں کے ہاں تاریخی شعور کی کارفرمائی علم و ادب کے ہر میدان میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس حوالے سے اگر ہم خصوصی طور پر اردو لغت نویسی میں تاریخی احساس و شعور کی کارفرمائی کا جائزہ لیں تو یہ روایت ہمیں بھرپور طور پر نظر آتی ہے۔آیندہ اوراق میں اسی حوالے سے اردو زبان کی نمایندہ اور ضخیم لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جسے مولوی سید احمد دہلوی نے ۱۹۱۸ء میں دہلی سے شائع کیا تھا۔مولوی صاحب نے اس ضخیم لغت کا آغاز ۱۸۶۸ء میں کیا تھا۔دس سال کی انتھک محنت کے بعد انہوں نے ۱۸۷۸ء میں زیر ترتیب لغت کے چند اجزاء ''ارمغان دہلی'' کے نام سے بطور نمونہ شائع کرائے اور بقیہ کام جاری رکھا، یوں ۱۸۹۲ء میں لغت کی تدوین کا کام مکمل ہوا اور اس کی طباعت شروع ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولوی صاحب کے گھر آتش زدگی کا حادثہ پیش آیا تو اس میں لغت کے بھی تمام مطبوعہ نسخے جل گئے اور یوں پوری لغت از سر نو شائع کرائی گئی۔یہ لغت چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کے صفحات کی تعداد ۲۸۵۳ ہے۔اس وسیع لغت میں عربی فارسی ترکی سنسکرت اور انگریزی کے ساٹھ ہزار سے زائد ایسے الفاظ جمع کیے گئے ہیں جو اردو تحریر اور روزمرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔

چونکہ لغت نویسی کا عمل تاریخ کے مختلف ادوار میں الفاظ کے مختلف مفاہیم کی تلاش کا ہی دوسرا نام ہے اس لیے فطری طور پر تاریخ، لغت نویسی کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے گویا تاریخی تصانیف کی حیثیت لغات نویسی کے لیے ابتدائی مسالے کی سی ہے جن کی بنیاد پر لغت نگار درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہوئے معانی کے فروق واضح کرتا چلا جاتا ہے۔علم، تاریخ کی تعریف و توضیح کے حوالے سے جب ہم کلاسیکی ادوار کے مسلمان مورخین پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو بقول عبدالرحمان ابن خلدون: ''تاریخ گزشتہ اقوام کے حالات و واقعات، اخلاق و رسوم اور انداز سیاست کا نام

ہے گویا تاریخ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسانی اجتماع کی خبر دیتی ہے اوران حالات کی بھی جو اس آبادی کو طبعی طور پر پیش آتے رہتے ہیں جیسے باہمی کشیدگی اور تناؤ، باہمی میل جول، حکومتوں کے مراتب اوران کے درجات، خاندانی حمیت و رعایت اور قسم قسم کے باہمی قہر و تسلط اوران نتائج کی بھی جو ان سے پیدا ہوتے ہیں جیسے فتوحات ملکیہ، حکومتوں کا ظہور، حکومتوں کے مراتب اور ان کے درجات اوران طریقوں کی بھی جو انسان اپنے اعمال و مساعی سے اختیار کرتا ہے۔(۵)

مشہور مسلمان مورخ علامہ شمس الدین سخاوی تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لسانی اعتبار سے تاریخ کے معنی ہیں وقت کے متعلق اطلاع''

ایک اور مورخ مسعودی لکھتے ہیں کہ تاریخ کوئی جامد اور ٹھوس چیز نہیں بلکہ قومیں اور معاشرے تبدیلیوں سے گزرتے رہتے ہیں، اسی بنیاد پر مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھے کہ کسی حکومت کی تبدیلی سے کسی قوم میں کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں۔(۶)

تاریخ کے مفہوم کی تعیین کے حوالے سے اگر ہم ان تعریفات کے بعد فرہنگ آصفیہ کی طرف نظر دوڑائیں تو وہاں بھی اس حوالے سے مکمل آگہی نظر آتی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کے نزدیک ''کسی چیز کے ظہور کا وقت تاریخ کہلاتا ہے، آگے لکھتے ہیں کہ کسی امر عظیم کے وقت کا تعین اور زمانہ کا عرصہ تاریخ کہلاتا ہے''۔(۷)

آپ کے نزدیک ''واقعات عظیمہ و سیر کی کتاب، وہ کتاب جس میں بادشاہوں کا حال مع سن پیدائش، جلوس اور وفات وغیرہ درج ہو''(۸) کتب تواریخ کہلاتی ہیں اوران کے نزدیک تاریخ ''اس فن کا نام ہے جس میں واقعات عظیمہ کا حال مندرج ہو''۔(۹)

اسی بنیادی احساس اور شعور کے تحت جب ہم فرہنگ آصفیہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تاریخی شعور کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مسلمان مورخین کے ہاں لغت نویسی کی روایت ابتدا ہی سے اس وسعت اور آفاقیت کی حامل رہی ہے کہ اس میں واقعات کو دھندلائے بغیر روایتوں کے اختلاف کو بلا کم و کاست بیان کیا جاتا ہے تاکہ واقعات اپنی اصل صورت میں سامنے آسکیں، اسی بنیاد پر ڈاکٹر جواد علی، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی ''تاریخ الرسل والملوک'' کے ضمن میں اسلامی تاریخ نگاری کی اسی روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس میں (تاریخ طبری) مولف نے مختلف تاریخی روایات نہایت ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ جمع کی ہیں، ہر روایت کو اس کے ناقل کی طرف منسوب کیا ہے اور حاشیہ آرائی کا کام قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ چاہے وہ حق میں فیصلہ کرے یا خلاف کرے، الطبری نے اپنی کتاب کی ہر فصل میں جن مراجع پر بھروسہ کیا ہے ان میں کچھ تو وہ زبانی روایات ہیں جو کہن سال بزرگوں سے اسے پہنچیں اور کچھ ان روایات کی بنیاد پر لکھی ہوئی تالیف ہیں جن سے الطبری نے فائدہ اٹھایا اس طرح اس نے بہت سے مصادر سے اپنی کتاب کا مواد فراہم کیا ہے اور ان مصادر کو باہم مربوط کرنے میں، نیز اپنی تاریخ سے قبل لکھی ہوئی کتاب سے واقفیت حاصل کرنے میں اس نے غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا ہے''۔(۱۰)

اس تاریخی شعور اور احساس کا ادراک فرہنگ آصفیہ میں بھی جا بجا ملتا ہے، مسلمانوں کے قبلہ اول ''بیت المقدس'' (۱۱) کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ خانہ پاک، متبرک گھر، مسجد اقصیٰ کا دوسرا نام، یروشلم کا عبادت خانہ جو ایشیائی روم میں واقع ہے اور قوم یہود کا قبلہ ہے، مکہ سے بیشتر اور انبیاء کا یہی قبلہ رہا ہے اور اس مقدس مکان کو حضرت داؤد علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل کے علت طاعون کے عذاب شدید سے نجات پانے کے شکریہ میں جبکہ ستر ہزار آدمی لقمہ اجل ہو چکے تھے بنوایا'' آگے مولف نے اس کی تعمیر کے آغاز اور نصف تعمیر کے بعد آپ کے فرزند رشید حضرت سلیمان کی سرکردگی میں اس کی بقیہ تعمیر و تکمیل، پھر بخت نصر کے ہاتھوں اس کی تباہی اور سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانہ میں اس کی دوبارہ مرمت و تعمیر اور دیگر مذاہب میں اس کے تقدس سے متعلق تاریخی مواد بحسن و خوبی جمع کر دیا ہے، پھر مسجد کی تاریخی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے، لکھتے ہیں:

''اقصیٰ اس وجہ سے اس کا نام ہوا کہ یہ مقام مرتبہ میں کمال انتہا کے درجہ پر پہنچا ہوا ہے''۔(۱۲)

اس مادے کی تاریخی تفصیل میں مصنف نے معاندین اسلام مستشرقین کے برعکس

مذہبی تعصّبات کو کہیں بھی جگہ نہیں دی ہے اور یہی احساس دیگر مواقع پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً اگر ہم زردشت: (۱۳) زبور (۱۴)، پنڈت (۱۵) بالمیک، (۱۶) افلاطون (۱۷)، ارسطو (۱۸) بیت العتیق، (۱۹) دیوار قہقہہ (۲۰) کے تحت دیکھیں تو اسلامی تاریخی شعور اپنی وسعت اور آفاقیت کے ساتھ ہمیں جلوہ گر نظر آتا ہے:

مشہور مسلمان مورخ شمس الدین السخاوی نے تاریخ نویسی کے حوالے سے اپنی مشہور کتاب ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ'' (۲۱) میں مسلمان مورخین کے تاریخی تصنیفات کے تنوع کو بخوبی واضح کرتے ہوئے کتب تاریخ کی درج ذیل اقسام بیان کی ہیں، آپ نے اپنی کتاب میں ان عنوانات کا کچھ یوں ذکر کیا ہے:

۱۔ سیرت النبی ﷺ ۲۔ صحابہ کی تاریخ ۳۔ تاریخ الخلفاء ۴۔ بادشاہوں، وزیروں کی تاریخ ۵۔ کاتبوں کی تاریخ ۶۔ فقہاء کی تاریخ ۷۔ ائمہ مجتہدین کی تاریخ ۸۔ عابدوں زاہدوں، صوفیا کی تاریخ ۹۔ معلموں اور وراقوں کی تاریخ ۱۰۔ مورخین کی تاریخ ۱۱۔ قراء کی تاریخ ۱۲۔ اہل سنت و الجماعت علماء اور محدثین کی تاریخ ۱۳۔ بڑے کاریگروں اور ماہر دستکاروں کی تاریخ ۱۴۔ عام لوگوں کی تاریخ ۱۵۔ قرآن، عشق، سماع، خوف اور حال سے جان دینے والوں کی تاریخ ۱۶۔ مختلف شہروں کی تاریخ ۱۷۔ نحویوں، لغویوں، شاعروں، بلاغت، عروض اور حساب کے ماہروں کی تاریخ ۱۸۔ مختلف شہروں کی تاریخ ۱۹۔ طبیبوں، فلسفیوں اور زندیقوں کی تاریخ ۲۰۔ شریف، سخی، عقلمند اور حکیم لوگوں کی تاریخ ۲۱۔ بدعتی اور ہوا پرست لوگوں کی تاریخ ۲۲۔ بری اور بحری اسفار کے ماہروں کی تاریخ ۲۳۔ کاہنوں، خرق عادت اور کشف والوں کی تاریخ۔

تاریخ کی ان اقسام سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا تاریخی شعور کس قدر وسعت اور گہرائی کا حامل تھا، تاریخ نویسی کی اس وسعت کے تناظر میں اگر ہم فرہنگ آصفیہ کو دیکھیں تو یہی وسعت ہمیں وہاں بھی نظر آتی ہے اور تاریخ نویسی کے ان تمام پہلوؤں کا ثبوت یہاں بھی موجود ہے۔ مولف فرہنگ نے ایک طرف جہاں مختلف شہروں اور خطوں کی جغرافیائی تاریخ بیان کی ہے وہاں ان خطوں میں بسنے والے افراد کے متنوع عقائد و مذاہب کے تعارف کے ساتھ ان مذاہب کے صحائف اور بانیان کا تعارف بھی کرایا ہے اس حوالے سے درج ذیل الفاظ کو

دیکھا جاسکتا ہے۔

یونان (۲۲)، یمن (۲۳)، ہمالیہ (۲۴)، وادی ایمن (۲۵)، ہوشنگ (۲۶)، نوشیرواں (۲۷)، ذوالقرنین (۲۸)، ہندو(۲۹)، ہنومان (۳۰)، قاہرہ (۳۱)، وید (۳۲)، دین اسلام میں سلسلۂ نبوت ورسالت کے تحت بھیجے جانے والے انبیاء کرام کا تعارف بھی فرہنگ کی زینت ہے اور اس حوالے سے حضرت محمد ﷺ (۳۳) اور دیگر انبیائے کرام کے احوال و آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔

چونکہ مولف فرہنگ آصفیہ کا آبائی تعلق خود ہندوستان سے تھا، اس لیے وہ ہندوستان میں کلاسیکل مسلمان مورخین کی تاریخ نویسی کی روایت سے بھی مستفید ہوئے ہندوؤں کے ہاں اس فن کے ساتھ اعتناء مسلمانوں کی آمد کے بعد شروع ہوا جیسا کہ سید سلیمان ندوی کی تصریحات ہیں (۳۴)، اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی اپنے مقالے میں اسی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

> The other two great civilizations with which the Arabs came into close contact where those of the Iranians and the Hindus. The Hindus never developed an interest in History. There is little indication of the Iranians possessing any notable historical literature at the the time of the Muslim conquest (۳۵)

اس لحاظ سے جب ہم عہد وسطی کی اسلامی حکومت اور انتظام و انصرام کے تناظر میں فرہنگ آصفیہ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس عہد کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور شناسائی کا احساس ہمیں ملتا ہے، چاہے وہ اس دور کے سلاطین ہوں یا لوگوں کی دینی وروحانی زندگی کی حفاظت وصیانت کے حوالے سے صوفیائے عظام اور دیگر رجال کار کا تعارف یا اس دور کے نظم مملکت کے حوالے سے مختلف مناصب اور عہدے، فرہنگ میں مختلف صفحات پر ان کا تعارف ہمیں ملتا ہے، جو خسرو (۳۶)، خان خاناں (۳۷)، ابوالفضل (۳۸)، اولیاء، اولیائے ہند (۳۹)، مرزا مظہر جان جاناں (۴۰)،

شاہ محمد غوث لاہوری (۴۱)، خواجہ ناصر (۴۲)، اکبر (۴۳)، اورنگ زیب (۴۴)، ہفت ہزاری (۴۵)، شحنہ (۴۶) اور فیضی (۴۷) کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

برصغیر کے دیگر غیر مسلم طبقات کا تعارف بھی ہمیں فرہنگ میں ملتا ہے، اس میں جہاں ہندوستان کے قدیم باشندوں یعنی ہنود اور ان کے مذہب کا تعارف مختلف الفاظ جیسے کشن (۴۸)، کبیر پنتھی (۴۹)، بیراگی (۵۰)، ہندو (۵۱)، ہولی (۵۲)، دیوالی (۵۳)، آواگون (۵۴)، وید (۵۵)، رامائن (۵۶)، پنڈت (۵۷) کے تحت دیکھا جاسکتا ہے، وہاں ہندوستان پر اپنی ریشہ دوانیوں سے حکومت قائم کرنے والے انگریزوں اور ان کے قائم کردہ اداروں کا تعارف بھی لغت میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

الغرض پوری لغت مسلمانوں کے روایتی تاریخ نویسی کے شعور سے معمور ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اسی اجتماعی شعور کی داد دیتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

> "مسلمانوں نے فن تاریخ میں جو ترقیاں کیں اس کی بین مثال یہ ہے کہ جس ملک میں بھی پہنچے اس کو تاریخ کی روشنی میں اجاگر کردیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے اس ملک میں اندھیرا پھیلا تھا مسلمانوں نے آکر مشعل جلادی۔ عرب، ایران، مصر وشام، عراق مغرب، اسپین ہندوستان ہر جگہ ان کے دم قدم سے تاریخ کی روشنی ہے ورنہ اسلام سے پہلے کا سرمایہ افسانوں، کہانیوں اور دیو مالا کے سوا کچھ نہ تھا"۔ (۵۸)

آج جب پوری دنیا میں مغربی اقوام اپنے سیاہ ماضی اور ظلم وجبر کی تاریخ کو پھر سے دہراتے ہوئے امت مسلمہ کے مختلف خطوں پر تباہی مسلط کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں اور اس کے پہلو بہ پہلو اپنے ان اقدامات کی مصنوعی اور جعلی تاریخ نویسی کی روش پر عمل پیرا ہیں، ان حالات میں دنیا کے کسی بھی خطے کا کوئی فرد اگر حقیقت حال سے روشناس ہونے کا طالب ہے، اس کے لیے واحد ماخذ اور ذریعہ مسلمان مورخین کی یہی کتابیں ہوں گی جو اسے سچائی تک پہنچانے کے لیے نشان راہ کا کام دیں گی۔

حوالہ جات

(۱) گیلانی، سید مناظر احسن، پاک و ہند مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ۱/ ۱۵۳، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س، ن۔

(۲) جاحظ، البیان و التبیین، دارالمعارف، بیروت، لبنان، ۱۹۹۲ء۔ (۳) ابن قتیبہ، المعارف، دارالنشر والتوزیع، قاہرہ، مصر، ۱۹۹۸ء۔ (۴) مبرد، الکامل فی الادب، دارصادر، بیروت، لبنان، ۲۰۰۱ء۔ (۵) ابن خلدون، المقدمہ، ص ۹، ۱۰، مکتبہ تجاریہ، س، ن۔ (۶) السخاوی، شمس الدین، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اهل التاریخ، ص ۳، دمشق، ۱۳۴۹ھ۔ (۷) مسعودی، مروج الذهب ومعادن الجواهر، ۱/ ۳، مصر، قاہرہ، ۱۳۴۶ھ۔ (۸) دہلوی، سید احمد، فرہنگ آصفیہ، ۱/ ۵۸۴، اردو سائنس، بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ڈاکٹر جواد علی، تاریخ طبری کے ماخذ، ۲۲۱، دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار، لاہور۔ (۱۲) فرہنگ آصفیہ، ۱/ ۴۵۹۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ۲/ ۴۰۳۔ (۱۵) ایضاً، ۱/ ۵۳۵۔ (۱۶) ایضاً، ۱/ ۵۳۷۔ (۱۷) ایضاً، ۱/ ۱۸۶۔ (۱۸) ایضاً، ۱/ ۱۴۵۔ (۱۹) ایضاً، ۱/ ۴۵۹۔ (۲۰) ایضاً، ۲/ ۳۱۵۔ (۲۱) السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اهل التاریخ، ص ۲۴۵۔ (۲۲) فرہنگ آصفیہ، ۴/ ۷۸۹۔ (۲۳) ایضاً، ۴/ ۷۸۶۔ (۲۴) ایضاً، ۴/ ۷۳۰۔ (۲۵) ایضاً، ۴/ ۷۶۳۔ (۲۶) ایضاً۔ (۲۷) ایضاً، ۴/ ۷۵۴۔ (۲۸) ایضاً، ۴/ ۶۱۶۔ (۲۹) ایضاً۔ (۳۰) ایضاً، ۴/ ۷۳۳۔ (۳۱) ایضاً، ۴/ ۷۳۹۔ (۳۲) ایضاً، ۳/ ۳۶۶۔ (۳۳) ایضاً، ۴/ ۶۸۹۔ (۳۴) ندوی، سید سلیمان، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی و علمی ترقی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۳۳-۵۷۔

(۳۵) M.M. Sharif, A History of Muslim Philosophy, Historiography, Royal Book Company, Karachi, 1983, P.1195-1219/2 ۔

(۳۶) فرہنگ آصفیہ، ۲/ ۱۹۰۔ (۳۷) ایضاً، ۲/ ۱۷۸۔ (۳۸) ایضاً، ۳/ ۳۵۸۔ (۳۹) ایضاً، ۱/ ۳۱۲-۳۲۶۔ (۴۰) ایضاً، ۱/ ۳۲۴۔ (۴۱) ایضاً۔ (۴۲) ایضاً۔ (۴۳) ایضاً، ۱/ ۲۱۱۔ (۴۴) ایضاً، ۱/ ۳۱۰۔ (۴۵) ایضاً، ۴/ ۷۱۹۔ (۴۶) ایضاً، شحنہ۔ (۴۷) ایضاً، ۳/ ۳۵۸۔ (۴۸) ایضاً، ۳/ ۵۲۸۔ (۴۹) ایضاً، ۳/ ۷۴۳۔ (۵۰) ایضاً، ۳/ ۳۴۵۔ (۵۱) ایضاً، ۴/ ۷۳۳۔ (۵۲) ایضاً، ۲/ ۷۲۸۔ (۵۳) ایضاً، ۴/ ۷۵۶۔ (۵۴) ایضاً، ۱/ ۷۳۰۔ (۵۵) ایضاً، ۴/ ۷۱۹۔ (۵۶) ایضاً، ۴/ ۶۸۹۔ (۵۷) ایضاً، ۳/ ۳۳۲۔ (۵۸) ایضاً، ۱/ ۵۳۵۔ (۵۹) سید سلمان ندوی (مرتب)، سید سلیمان ندوی کے چند نادر خطبات و رسائل کا مجموعہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۲۸۔

اخبار علمیہ

حفظ قرآن کی بین الاقوامی تنظیم کے جنرل سکریٹری عبداللہ بسفار نے اطلاع دی ہے کہ ایک بین الاقوامی قرآنی کانفرنس شاہ عبداللہ کے زیر سرپرستی ۵ رتا ۷ رجون منعقد کی جائے گی جس میں قرآن خوانی کے لیے جدید ٹکنالوجی کے استعمال کا جائزہ لیا جائے گا، یہ اپنی نوعیت کی اولین کانفرنس ہوگی، تنظیم ۶۵ ملکوں میں متعدد قرآنی مکاتب کا انتظام کرتی ہے جہاں سے اب تک تیس ہزار حفاظ قرآن فارغ ہو چکے ہیں، حفظ قرآن اور قرأت کے ساتھ علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر مسلم نوجوانوں میں مطالعہ و رابطہ قرآن کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مسابقتی پروگرام کراتی ہے، مجوزہ کانفرنس ان مقاصد کو مستحکم کرنے کی کوششوں کی توسیع بھی ہے، مستقبل میں مطالعۂ قرآنیات کے لیے ایک عالمی کونسل اور ایک سیٹیلائٹ ٹی وی چینل قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے۔

چنئی کی کرونا انٹرنیشنل نامی تنظیم کی جانب سے فروغ امن اور سماجی خدمات کے اعتراف میں ممتاز شخصیات کو ''کرونا رتن ایوارڈ'' دیا جاتا ہے، اس مرتبہ بابائے سبز انقلاب ایم ایس سوامی ناتھن کو ان کی نمایاں سماجی خدمات پر ایک تقریب میں اعزاز سے نوازا گیا ہے، اس میں ایم ایس سوامی ناتھن نے صاف لفظوں میں کہا کہ ملک میں اسلامی بینکنگ نظام کو روشناس کرانے کی شدید ضرورت ہے، غربت کے خاتمہ کا یہی ایک نسخۂ کیمیا ہے جس کے استعمال سے کسانوں کی خودکشی کے بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے، انہوں نے کہا کہ قرض داروں کا بے تحاشہ استحصال کیا جارہا ہے، کسان سود کے بوجھ تلے خودکشی پر مجبور ہوتے جارہے ہیں، چونکہ اسلام میں سود کا لینا دینا دونوں حرام ہے اور اسلامی بینکنگ کے ذریعہ کوئی سود لیا دیا نہیں جاتا ہے اس لیے اس لعنت کا واحد علاج اسلامی بینکنگ نظام کا فروغ دینے میں ہے۔

خبر ہے کہ امریکی صدر اوبامہ کے مشیروں نے قومی حفاظتی پالیسی پر نظر ثانی کا منصوبہ بنایا ہے، جس کے تحت امریکی میڈیا میں ''اسلامی شدت پسندی'' جیسی اصطلاحات استعمال نہیں کی جاسکیں گی، قومی حفاظتی حکمت عملی کی دستاویز حکومت کی کارگزار کمیٹی کی جانب سے وقفہ وقفہ سے تیار کی جاتی ہے،

بش کے دور اقتدار میں جو دستاویز تیار کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ''اکیسویں صدی کے اوائل میں اسلامی شدت پسندوں اور عسکریت پسندوں کے خلاف جدوجہد سب سے بڑی نظریاتی لڑائی ہوگی''، اوبامہ سیکورٹی انتظامیہ نے اس جملے کو ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے، اوبامہ نے عالم اسلام کی دل جوئی کے لیے وہائٹ ہاؤس میں اس قسم کے متعدد اقدامات کیے ہیں، حالیہ تبدیل شدہ پالیسی کی ایک مثال ایک اسلامی اسکالر طارق رمضان کو امریکہ میں اسلامی موضوعات پر لیکچر دینے کی اجازت ہے، بش دور اقتدار میں امریکہ میں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔

ہندوستان کے مسلم تعلیمی اداروں کی مالی امداد میں سعودی عرب ایک مدت سے پیش پیش رہا ہے، خبر ہے کہ آئی ڈی بی (اسلامک ڈیولپمنٹ بینک) نے مسلم تعلیمی اداروں کی ترقی کے لیے متعدد نئے پروجیکٹوں کو منظوری دی ہے، ان پر ابتدا میں چھ لاکھ ڈالر کی سرمایہ کاری کی جائے گی، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے ذریعہ چلائے جانے والے سول سروسز کوچنگ انسٹی ٹیوٹ کا ایک اور سنٹر نئی دہلی میں اور تین عالمی سطح کے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیے جائیں گے، دہلی اقلیتی کمیشن کے چیرمین اور سنٹرل بینک آف انڈیا کے ڈائریکٹر نے کہا کہ یہ منصوبے مسلمانوں کی سماجی و معاشی ترقی کے لیے بڑے اہم ہیں، مسلمانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سائنس دانوں نے جنوبی افریقہ کے برابرٹن پہاڑی سلسلے میں موجود قدیم کیلسائٹ چٹانوں میں پائے جانے والے معدنیات سے حاصل شدہ باقیات کے تجزیہ میں کہا ہے کہ ۳ارب ۴۵ کرور سال قدیم ارضی مقناطیسی قوت آج کے مقابلے میں کہیں کم تھی، چونکہ یہ مقناطیسی قوت زمین پر مضرت رساں شمسی شعاعوں کو واپس کرتی ہے اور دنیا کے گرد حفاظتی ڈھال بناتی ہے، اس لیے جدید سائنس میں اس کا مطالعہ خاص دل چسپی کا موضوع ہے، یہ انکشافات ویانا ارضیاتی سائنس پر ہونے والے ایک اہم اجلاس میں سامنے آئے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے انسانی زندگی کے لیے ارضی مقناطیسیت انتہائی اہم ہے، برابرٹن سے لیے جانے والے نمونے کے تجزیہ میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ کرہ ارض کے گرد موجود حفاظتی ڈھال ابتدائی زندگی کے زمانہ میں بہت کمزور تھی۔

دور حاضر کی طبی سائنسی ترقیات میں مسلمانوں کی موجودہ افسوس ناک بے توجہی سے ایسا لگتا ہے کہ بہ حیثیت قوم مسلمانوں نے اس دنیا کو ترقی و سائنس کے نام پر شاید ہی کچھ دیا ہو لیکن یہ تصور صحیح نہیں

ہے، سرجری میں استعمال کیے جانے والے زیادہ تر آلات دسویں صدی کے مشہور جراح ابوالقاسم الزہراوی کے وضع کردہ ہیں، اس کے ایجاد کردہ آلات جراحی میں نشتر، ہڈی سے بنی آری، آنکھوں کے نازک ترین آپریشن کے لیے ہڈی سے بنے کانٹے اور دیگر دوسو سے زائد آلات شامل ہیں، اس عظیم جراح نے پہلی بار آپریشن کے اصول وضوابط بنائے، آپریشن کے دوران اندرون جسم گھل جانے والا دھاگہ مسلمانوں کی ایجاد ہے، ابن نفیس نے خون کے دباؤ بلڈ پریشر) کی وضاحت کی، اس کے چار سو سال بعد یورپ میں ولیم کے نام یہ دریافت ہے، موتیابند کے لیے سوراخ کرنے والی سوئیاں اور افیون اور الکحل کے آمیزے سے مریض کو بے ہوش کرنے کی تکنک مسلمان اطباء کی ایجادات ہیں، عام طور پر ویکسین طریقہ علاج کی دریافت جینز اور پاسچر سے منسوب کی جاتی ہے حالانکہ یہ طریقہ مسلم اطباء میں بہت پہلے سے متعارف ورائج تھا، ۱۷۲۴ء میں ترکی میں مقرر برطانوی سفیر کی بیوی نے وہاں سے سیکھا اور یورپ میں متعارف کرایا، ترکی میں بچوں کو چیچک ہوجانے پر اس کا علاج بھینسوں سے خارج ہونے والے مادہ یا وائرس سے کیا جاتا تھا اور اس سے چیچک زدہ بچوں کو ٹیکہ لگایا جاتا تھا۔

امریکی اخبار ''سائنس کرسچین مانیٹر'' میں اقوام متحدہ کی عالمی زبانوں سے متعلق شائع شدہ جائزہ میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی ۱۹۹ زبانیں معدوم ہونے کے قریب ہیں، ان میں بعض زبانوں کے بولنے والے محض ۱۰/افراد ہیں اور ۱۸/زبانیں تو ایسی ہیں کہ ان کا بولنے والا بھری دنیا میں تنہا ہے جس کا کوئی ہم زبان نہیں، رپورٹ کے مطابق ہر دو ہفتے بعد دنیا سے ایک زبان ختم ہورہی ہے۔

شارجہ میں عربی فن خطاطی کی نمائش کا افتتاح وہاں کے حکمراں شیخ سلطان بن محمد القاسمی نے کیا، عرب ملکوں کے علاوہ جاپان، چین، کوریا اور جرمنی کے ۳۳۳ فنکاروں کے ۸۲۱ شہ پارے اس نمائش میں رکھے گئے، قرآن کی کتابت کے ایک سے ایک خوبصورت نمونے شائقین کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، ۷/جون تک یہ نمائش جاری رہے گی۔

مشرقی ترکی میں واقع جبل ارارات کی ۴ ہزار میٹر بلند چوٹی پر موجود کچھ چوبی ٹکڑے ملے ہیں جن کے بارے میں چین اور ترکی کے ۱۵/رکنی عیسائی محققین نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ تقریباً چار ہزار آٹھ سو برس پہلے تیار کی گئی کشتی نوحؑ کے ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں میں لکڑی کی کیلیں لگی ہیں، خیال ہے کہ اس حصے میں جانوروں کو رکھا گیا ہوگا۔

معارف کی ڈاک

نجیب محفوظ اور نوبل انعام

حبیب منزل،
میرس روڈ،علی گڑھ
۲۰۱۰/۵/۴ء

مکرمی ومحترمی السلام علیکم

معارف کا اپریل کا شمارہ کسی قدر تاخیر سے آج موصول ہوا۔ جناب فاخر جلال پوری نے کسی گزشتہ مضمون کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ''مصری ادیب نجیب محفوظ کو......نوبل انعام ......ان کی مجموعی ادبی خدمات پرنہیں بلکہ عقیدۂ الٰہ پر اعتراض اور نبوت کے انکار پر ملا تھا''۔ کسی مسلمان پر اتنا بڑا الزام بغیر سند عائد کرنا نہایت معیوب ہے۔ادب کا نوبل انعام مجموعی خدمات پرنہیں، کسی خاص تصنیف پر دیا جاتا ہے اور نجیب محفوظ کو یہ انعام ان کے ناول ''اولاد الحارّہ'' پر ملا تھا۔اس ناول پر اعتراض یہ ہے کہ نجیب محفوظ نے اس میں بعض کرداروں کے مقدس نام لکھے ہیں جو ان کرداروں کے افعال سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ ''عقیدۂ الٰہ پر اعتراض'' اور ''نبوت کے انکار'' کی جب تک اس ناول سے کوئی شہادت مہیا نہ کی جائے اسے تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ پھر بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ ''عقیدہ'' اور وہ ''انکار'' خود نجیب محفوظ کا ہے یا ان کے کسی کردار کا، میں نے یہ ناول پڑھا ہے لیکن بات پرانی ہوگئی حافظے میں پورا مواد محفوظ نہیں ہے۔

نیازمند

(پروفیسر) ریاض الرحمان شروانی

خواجہ نظام الدین اولیاء اور سجدۂ تحیت

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج۔
پوسٹ بکس نمبر بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن (بہار) ۸۴۵۴۵۳

۸/ ۵/ ۲۰۱۰ء

محترمی، السلام علیکم

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

ناچیز کے مضمون ''حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒء اور سجدۂ تحیت'' کے متعلق آپ نے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی مدظلہ کے حوالے سے فون پر بتایا تھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نزدیک سجدۂ تحیت جائز نہیں ہے لیکن فوائد الفواد کے مرتب خواجہ حسن سجزیؒ نے حضرت نظام الدین اولیاؒء کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

> ''...... بر من خلق می آید و روی بر زمین می آرد، چوں پیش شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہما العزیز منع نہ بود من ہم منع نمی کنم''۔
>
> (فوائد الفواد، ص ۲۰ ۷)

اگر کسی دوسرے مستند حوالے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نزدیک سجدۂ تحیت کے عدم جواز کا ثبوت ملتا ہے تو اس کا اظہار ضروری ہے۔ اس لیے اگر میرے مضمون میں کوئی قابل اعتراض بات ہے تو اس کی تصحیح ہو جانی چاہیے۔ ظلی صاحب مدظلہ کو یا آپ کو پورا اختیار ہے ترمیم و اضافے کا۔

۶/ مئی ۲۰۱۰ء کو اچانک میری طبیعت خراب ہوگئی۔ پانی چڑھوانے کے بعد افاقہ ہوا۔ اب تو ٹھیک ہوں لیکن بہت کم زور ہو گیا ہوں۔ تصوف پر مضمون مرتب کر چکا ہوں۔ نشاط طبع مفقود ہے، اس لیے جب طبیعت سنبھل جاتی ہے تو اسے ارسال کروں گا۔ سر دست ایک غزل

ارسال ہے۔ شاید پسند آجائے۔ طبیعت ناساز تھی اس لیے:

یاد کرلیں گے مجھے اپنی دعاؤں میں کبھی
میں اگرچہ شاعر بدنام و ناکارہ سہی

محتاج دعا
(جناب) وارث ریاضی

تبصرہ کے متعلق چند باتیں

شعبہ اسلامک اسٹڈیز،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
یکم مئی ۲۰۱۰ء

مدیر محترم ''معارف''، دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

معارف کے اپریل ۲۰۱۰ء کے شمارے میں ناچیز کی کتاب پر تبصرہ کی اشاعت کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ تبصرہ میں کتاب سے متعلق ضروری مندرجات میں کچھ باتیں ذکر ہونے سے رہ گئی تھیں، ان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

۱- کتاب کا نام ''عہد اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت و معیشت اور حکومت کے مسائل'' درج کیا گیا ہے۔ کتاب کا صحیح و مکمل نام یہ ہے: عہد اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل (علماء کی فقہی تشریحات اور حکمرانوں کے اقدامات کا مطالعہ)۔

۲- کتاب کے ملنے کے پتہ میں ''دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔ ۲۷۶۰۰۱'' بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ ذکر ہونے سے رہ گیا ہے۔

۳- کتاب میں تفصیلات اشاعت کے صفحہ پر سب سے پہلے یہ لکھا ہوا ہے: ''جملہ حقوق بحق دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی محفوظ''۔ تبصرہ میں اس کا بھی ذکر آگیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔

والسلام مع الاکرام

ظفر الاسلام اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

سہ ماہی خبر نامہ: مدیر مولانا سید نظام الدین، صفحات: ۱۴۴، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت: ۸۰ روپے، پتہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ۷۶A/۱، مین مارکیٹ اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ہندوستانی مسلمانوں کا غالباً تنہا ایسا ادارہ ہے جو متفق علیہ ہے اور معتمد علیہ بھی، اس کی تاریخ نسبتاً مختصر ہے لیکن اس کی خدمات کا دائرہ محدود ہوتے ہوئے بھی بہت وسیع اور متنوع ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قانون میں شریعت کے تحفظ، حکومتوں اور عدالتوں کے بے جا مداخلت کا دفاع اور داخلی طور پر مسلم معاشرے میں اصلاح، اس کا اصل مقصد ہے، زیر نظر رسالہ خبر نامہ کے نام سے ہے یعنی بورڈ کی سرگرمیوں کے متعلق مسلسل باخبر رکھنا اس کی غرض و غایت ہے، مقدمات کی نگرانی، تفہیم شریعت، دار القضا، لیگل سیل جیسے ذیلی اداروں کے ساتھ بورڈ ان موضوعات پر اردو انگریزی اور اہم ملکی زبانوں میں بھی کتابوں کے نشر و اشاعت کا اہتمام بھی کرتا ہے، جلسوں اور کانفرنسوں کا انعقاد بھی ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، ملت اسلامیہ ہندیہ کو بیدار کرنے اور رکھنے کے لیے یہ ساری مساعی نہایت قابل قدر ہیں، زیر نظر خبر نامہ بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے، جس میں کئی عمدہ مضامین شامل ہیں جیسے عورت اور معاشی تحفظ، اسلام میں اولاد کی تربیت قرآن کی روشنی میں، امت مسلمہ اور اصلاح معاشرہ، خواص امت کا رتبہ و شیوہ، ہندوستان کا موجودہ قانون وقف، اقلیتوں کے حقوق اور ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال، اودھ بالخصوص لکھنؤ میں اسلامی شریعت و قانون کی تشریح و تطبیق اور حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب وغیرہ، یہ سارے مضامین محترم مدیر مولانا سید نظام الدین کے اس اداریتی قول کے تشریح و ترجمان ہیں کہ ہندوستانی مسلم عوام اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت نیز علمائے ہند کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی حکمتوں، ضرورتوں کی ایسی تشریح کریں جس سے اسلامی شریعت کی افادیت و مصلحت زیادہ بہتر انداز سے سمجھ میں آسکے اور اس کی نافعیت ثابت ہوسکے، شروع میں صدر بورڈ کا ایک مختصر لیکن بہت جامع و نافع پیغام بھی ہے، محمد وقار الدین لطیفی

ندوی کے بورڈ کی کارکردگی رپورٹ میں تازہ ترین اطلاعات کے علاوہ خبر نامہ کی اس سے قبل کی جلدوں کے مضامین کی بھی ایک جھلک موجود ہے، یہ مفصل رپورٹ تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔

رسالہ مواد، ترتیب اور طباعت کی خوبیوں سے آراستہ ہے اور یہ اس لائق ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ ہر مسلم ادارے میں بھی یہ موجود رہے۔

ماہنامہ راہ اعتدال (خصوصی شمارہ تعلیم نمبر): مدیر حبیب الرحمان اعظمی

عمری، صفحات: ۱۹۲، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت: فی شمارہ ۱۰ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے، خصوصی شمارہ ۴۰ روپے، پتہ: منیجر راہ اعتدال، جمعیت ابنائے قدیم، جامعہ دارالسلام عمرآباد ۶۳۵۸۰۸، جنوبی ہند۔

جنوبی ہند کے ممتاز دینی و تعلیمی اداروں میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کا نام نمایاں ہے، اس کا ماہانہ ترجمان رسالہ راہ اعتدال کے نام سے عرصے سے شائع ہو رہا ہے، ہر شمارہ مفید مضامین پر مشتمل ہوتا ہے لیکن وقتاً فوقتاً بعض شمارے کسی ایک موضوع سے خاص ہوتے ہیں، ایسے کئی خاص نمبروں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، وقت کی ضرورت ان خصوصی شماروں کی خاص محرک ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑے طبقے کی پس ماندگی ظاہر ہے اور اس کی وجہ بھی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور وہ ہے تعلیم کے باب میں اب بھی عام بے حسی اور کم ہمتی کی روش جب کہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ قومی ترقی و سربلندی کے لیے اصل کلید تعلیم ہے، معاشی و معاشرتی ضرورت کے ساتھ یہ دینی فریضہ بھی ہے، اس لیے اس میں کوتاہی کا کوئی جواز نہیں، یہ سچ ہے کہ آج دینی اور عصری دونوں طرح کی درس گاہیں پہلے کی بنسبت زیادہ ہیں مگر مطلوب و مقصود نتائج بہرحال حوصلہ افزا نہیں، اسی مقصد سے اس خاص نمبر کو پیش کیا گیا ہے کہ اولاً تو تعلیم کی تحریک کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے اور اس سے بھی زیادہ مناسب تربیت کی ضرورت ہے کہ تعلیم گاہیں محض درس گاہ نہ ہوں بلکہ ان کی شناخت عمدہ تربیت گاہ کی ہونی چاہیے۔

شمارے میں پچیس سے زائد مقالات و مضامین ہیں، تنوع بھی اسی لحاظ سے ہے، تعلیم و تربیت کی مذہبی اہمیت موجودہ طریقہ کی افادی اور مضرت رساں پہلوؤں پر بحث کے علاوہ موجودہ حالات میں تعلیمی منصوبہ بندی پر میر کاروانِ تعلیم جناب سید حامد کی تحریر خاص طور پر مطالعہ کی دعوت دیتی ہے، جس میں کئی نہایت مفید منصوبوں کے مشورے کے بعد یہ یاد دلایا گیا ہے کہ منصوبہ بنانا تو

آسان ہے لیکن عمل کی منزل تک تبھی پہنچتا ہے جب وہ عوام کی رگ جاں کو چھوتا اور لہو کے ساتھ ان کی رگوں میں دوڑتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پوری قوم کا ایک ہی مقصد ہو جسے ہر فرد اپنے نجی مقاصد پر فوقیت دے، مقصد کی وحدت، قوم کی شیرازہ بندی کے علاوہ اس کو سرگرم عمل بھی کر دیتی ہے، سید حامد کے اس مضمون میں مولانا سید سلیمان ندوی کے اس خطبہ سے اکتساب کیا گیا ہے جسے ۱۹۳۳ء میں پیش کیا گیا تھا اور جس میں جناب سید حامد کے بقول روح تعلیم کو کشید کیا گیا ہے، اس خاص نمبر کے قارئین کے لیے یہ تحریر بجائے خود ایک قیمتی سوغات ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ہماری درس گاہوں کا ماحول زیادہ صالح، صحیح اور طاقت بخش ہو، تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علاحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق وفضائل کے حامی ہو، اس سلسلہ میں ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی کا مضمون بھی قابل ذکر ہے جس میں کہا گیا کہ اچھا انسان اور اچھا شہری بننے کے لیے اچھا مسلمان بن کر اور عصری علوم سے مزین ہو کر زندگی گزارنا ہماری ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے، ایک اور مفید مضمون گھر، استاد، نصاب تعلیم اور ماحول جیسے تعلیمی عناصر کے متعلق ہے، لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں یہ احساس کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ غیرت کے معاملے میں بھی کچھ اصول ہوں جن سے ہم صحیح موقع پر صحیح فیصلہ لینے والی قوم کے طور پر جانے جائیں، اس کی مزید وضاحت بعد کے ایک مضمون سے بھی ہوتی ہے جو مخلوط تعلیم کے باب میں ہے اور جس کے لحاظ سے اسلام کا عہد زریں میں مخلوط تعلیم کا رواج نہیں ملتا اس کے باوجود خواتین نے اسلام کے عطا کردہ حقوق کی نعمت سے دینی، فکری، علمی، سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں ترقی کی اور یوں بھی ہوا کہ وہ کبھی مردوں سے سبقت بھی لے گئیں۔

غرض کہ یہ خاص نمبر تعلیم کے موضوع پر متعدد فکر انگیز اور بصیرت افروز مقالوں کا بہترین مجموعہ ہے، کیوں کہ سب میں موضوع کا پورا خیال رکھا گیا ہے اور ہر ایک جداگانہ خصوصیت واہمیت کا حامل ہے۔

ماہنامہ تمثیل نو (خصوصی شمارہ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر): مدیرہ ڈاکٹر زہرہ شمائل، صفحات: ۲۲۴، کاغذ وطباعت بہتر، قیمت: فی شمارہ درج نہیں، سالانہ ۱۰۰ روپے، خصوصی شمارہ ۴۰ روپے، خصوصی تعاون ۵۰۰ روپے، تاحیات ۵۰۰۰ روپے، پتہ: تمثیل نو، قلعہ گھاٹ دربھنگہ -۴۔

دربھنگہ کی سرزمین سے شائع ہونے والا یہ رسالہ تمثیل نو دراصل اردو اور خصوصاً بہار میں اردو ادب کی اطمینان بخش رفتار و ترقی کی مثال ہے، خود اس نے اپنی شناخت یہ کہہ کر ظاہر کی ہے کہ جدید تر شعری وادبی رجحانات کا ترجمان ودیا ساگر آنند پروفیسر مناظر عاشق، پروفیسر عبدالمنان طرزی، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر امام اعظم جیسے اہل قلم کی شرکت سے اس دعوے کو تقویت بھی ملتی ہے، اس سے پہلے اس نے سات سمندر پار کے ہم عصر اردو ادب کی سیر کرائی تھی، یہ تازہ شمارہ اس انداز کا خاص نمبر تو نہیں لیکن ضخامت کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقری شخصیت پر ایک مفصل گوشے نے اس کو خصوصیت بخش دی، مولانا آزاد کے اس گوشہ گیر مطالعہ کا موضوع ان کی مدبرانہ و مفکرانہ شان ہے، مقصد یہ ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کے یہ اجالے آج بھی قومی زندگی میں کارآمد ثابت ہوں، کوشش شعوری طور پر یہ ہے کہ مولانا کے کارناموں کا ازسرنو جائزہ لیا جائے، عقیل ہاشمی، عبدالواسع، مناظر عاشق، وہاب قیصر، مجید بیدار، ایم اے ضیاء، ارشد جمیل، ظفرالدین اور امام اعظم کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، ادب و تنقید، سیاست و صحافت، شخصیت جیسے گوشے روشن ہوئے ہیں، ان میں تازگی بھی ہے اور جدت بھی، علامہ اقبال کے حوالے سے بھی ایک مضمون ہے جس میں اقبال کی خودی اور آزاد کی خود شناسی کا سرچشمہ الکتاب کو قرار دیا گیا ہے کہ ان دونوں عہد ساز شخصیتوں نے اسلام کے نظریہ توحید اور عمل تقوی پر اپنی فکر کی بنیاد رکھی ہے، مسلم سیاست اور مولانا آزاد کے عنوان سے اظہار کیا گیا ہے لیکن دوسرے مضامین کے برخلاف اس میں تشنگی اور تجزیے کی کمی کا احساس ہوتا ہے، ''ہوسکتا ہے کہ مولانا آزاد بھی ڈپریشن کے شکار ہوگئے ہوں''، جیسے جملے مضمون کو ہلکا کرتے ہیں، اس خاص گوشۂ آزاد کے علاوہ رسالے کے مستقل ابواب میں مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں، تبصرے اور خطوط وغیرہ بھی ہیں، شروع میں پاکستان کے پروفیسر نظیر صدیقی کا ایک مکتوب ہے جس میں ہندوستان میں وقت کو خوش گوار طریقے سے گزارنے پر رشک کا اظہار جس طرح کیا گیا ہے، آج کے ایک طبقے کی دانش وری کا معیار عبرت انگیز ہے، لکھتے ہیں کہ ''یہاں (پاکستان میں) اسلام جیسے خشک مذہب اور خودغرضانہ سیاست کے سوا کیا ہے''، اچھا ہوا کہ اس خط کے معاً بعد پروفیسر سید منظر امام کی سرگذشت کا ایک حصہ شائع کیا گیا ہے، خدا کرے یہ تحریر پروفیسر نظیر صدیقی کی نظر سے گزر جائے، اس رسالے کا اداریہ بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں ادارتی خیالات کے ساتھ ادبی و ثقافتی اور

وفیاتی خبروں کو پوری تفصیل کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے، طباعت اچھی ہے لیکن کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، کہیں یہ زیادہ محسوس ہوتی ہیں جیسے الہلال کا اجراء ۱۹۵۰ء میں ہوا۔

ماہنامہ مرآۃ الصالحات : اڈیٹر آمنہ سحر بنت علی احمد، صفحات : ۲۲۴، کاغذ و طباعت بہتر ، قیمت درج نہیں ، پتہ : جمعیۃ الطالبات ، جامعۃ الصالحات ، بانسی ، سدھارتھ نگر یوپی۔

جامعۃ الصالحات بانسی ، سدھارتھ نگر میں بچیوں کا مشہور مدرسہ ہے ، طالبات کی انجمن جمعیۃ الطالبات کے سالانہ ترجمان کی حیثیت سے مرآۃ الصالحات واقعی ان بچیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی فکری و تحریری صلاحیتوں کا خوب صورت آئینہ ہے، قرآنیات ، بحث و نظر ، اسلامیات ، شخصیات، ادبیات، معلومات عامہ، حسن انتخاب جیسے موضوعات پر چھوٹی بڑی ہر تحریر ان بچیوں کے صالح خیالات و احساسات کا نمونہ ہے، اداریہ کے عنوان یعنی وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ سے بچیوں کی خودی و خود شناسی کا آہنگ بھی ظاہر ہوتا ہے جس کا ایک ضروری حصہ گلہ و شکوہ بھی ہے اور وہ اس طرح ظاہر ہوکر رہا کہ ہندوستان میں عرصے سے مرد کی تعلیم و اصلاح کی طرف توجہ رہی، عورتوں کو نظر انداز ہی کیا گیا لیکن ماضی کی یہ افسوس ناک صورت حال اب کم اور ختم ہوتی جارہی ہے، بچیوں کا یہ گلہ محض شکوہ نہیں اداریے سے ان کے اس عزم کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ دینی تعلیم سے ایسی خواتین تیار ہوں گی جو باطل کے مقابلے میں حق کی گواہ بنیں گی، خوشی کی بات ہے کہ ان بچیوں کو مشاہیر امت کی سرپرستی اور دعائیں حاصل ہیں جس کا اندازہ پیغامات سے ہوتا ہے، اردو کے علاوہ انگریزی ہندی اور عربی میں بھی طالبات کے مضامین ہیں، جدید مسلم معاشرے کے لیے یہ واقعی خوش آئند بات ہے۔

اظہار (لیب جرنل) : مدیر محمد فریاد، صفحات : ۸، کاغذ و طباعت عمدہ ، قیمت درج نہیں، پتہ : ترسیل عامہ وصحافت، آئی ایم سی بلڈنگ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ، گچی باؤلی، حیدرآباد۔

حیدرآباد دکن میں جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی اور کچھ شعبوں کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت ملک اور حکومت کی ایک خاص ذہنیت ، خصوصاً اردو سے عدم دلچسپی کی ایک

خاص روش کے تناظر میں شاید ہی کسی نے اس ادارے کے متعلق حسن ظن کا اظہار کیا ہو، بہت سے بہت یہ اور سرکاری اردو اداروں کی طرح ایک امید کی کرن تھی لیکن ذمہ داروں اور کارکنوں کے خلوص کی برکت تھی کہ اس یونیورسٹی نے نہایت کم عرصے میں پورے ملک اور اردو دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کر کے اپنی نسبت آزاد کی لاج رکھ لی، دس سال کی عمر ایک یونیورسٹی کے لیے واقعی بہت کم ہے لیکن عزم وحوصلہ ہو تو دس سال میں ایک سو دس سال کا کام بھی ہو سکتا ہے، آج اپنی عمارتوں، نصاب، روز افزوں روایتی اور جدید ترین شعبوں کی وجہ سے اس لائق ہے کہ یہ توقع بے جا نہیں رہی کہ اس کی سرگرمیاں اردو کے ان علاقوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں جو ترقی کی روایتی گذرگاہوں سے کافی دور ہیں، اس کی کلاہ فخر میں تازہ اضافہ یوں ہوا کہ NAAG جیسے خودمختار ادارہ کی جانب سے اس کو اے گریڈ دیا گیا، یہ ادارہ معیار تعلیم کی جانچ کے لیے خاص ہے، اس کی موجودہ چانسلر محترمہ ڈاکٹر سیدہ حمید کو بھی اندازہ ہے کہ ملک کے موجودہ حالات میں اس یونیورسٹی کا رول بہت اہم ہے، زیر نظر رسالہ اظہار یونیورسٹی کے سرگرمیوں کا محض واقعاتی اظہار ہی نہیں، اس کی مثبت فکر اور ایجابی نقطہ نظر کا بھی اظہار ہے، مایوسی یقیناً ناپسندیدہ چیز ہے اور اس کا اظہار اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے اعراض وانحراف ہے، یہ نکتہ اس شمارہ کے ذمہ داروں سے پوشیدہ نہیں اس کی پہلی سرخی ہی امید اور عزم کا پیغام دیتی ہے کہ یونیورسٹی کے شعبہ ماس کمیونی کیشن نے ایک عوامی جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نوے فیصد اردو قارئین اخبار خرید کر پڑھتے ہیں، اظہار نے اس اظہار حقیقت سے مایوسی کو خوش آئند توقع میں بدل دیا، اس پہلے شمارے میں قدرتاً یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کی روداد ہے لیکن مضامین بھی ہیں اور یہ معلومات افزا ہیں جیسے ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ، مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم، ٹی وی اینکرنگ ایک ہنر، حیدرآباد گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ وغیرہ، تاثراتی مضمون اور مزاحی کالم بھی ہے، اس طرح اس میں ہر قاری کے لیے لطف ولذت بھی ہے، طباعت کا اعلیٰ معیار، تصاویر کی خوب صورت پیش کش، یونیورسٹی کے معیار کے مطابق ہے، ہم دل سے اظہار کے لیے تحسین وآفرین کا اظہار کرتے ہیں۔

ت-ا-ندوی

ادبیات

محبت

جناب وارث ریاضی صاحب

محبت سے ہنگامۂ ''کن فکاں'' ہے محبت ہی وجہ نمودِ جہاں ہے
محبت کا احساں ہے کون و مکاں پر زمیں پر، زماں پر، مہہ و کہکشاں پر
محبت سے ہے سلسلہ زندگی کا محبت سے ہے ارتقا آگہی کا
محبت سے دنیا میں تابندگی ہے محبت سے زیبائی زندگی ہے
محبت سے پودوں میں جوشِ نمو ہے محبت سے گل زار میں رنگ و بو ہے
محبت کے نغموں سے دنیا جواں ہے محبت سے رعنائی جسم و جاں ہے
محبت کے جلوے ہیں ہر انجمن میں چمن میں، بیاباں میں، دریا میں، بَن میں
محبت بناتی ہے انساں کو انساں محبت میں ہندو نہ کوئی مسلماں
محبت کا مذہب ہے اخلاص و احساں محبت سے شمع وفا ہے فروزاں
محبت کو الفت ہے صدق و صفا سے محبت کو نفرت ہے کذب و ریا سے
محبت ہے کشتی، محبت ہے ساحل محبت سے آسان مشکل مراحل
محبت سے ہمت، محبت سے جرأت محبت ہے طاقت، محبت ہے قوت
محبت میں سرشاریِ جستجو ہے محبت میں تسخیرِ فطرت کی خو ہے
محبت کی ہے حکم رانی جہاں پر محبت ہی غالب ہے کون و مکاں پر
محبت کی ہر چیز میں ہے سمائی محبت کی چاروں طرف ہے خدائی

محبت ہی دنیا میں حاجت روا ہے
جو سچ پوچھیے تو محبت خدا ہے

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳۔

محبت نہ ہوتی تو غم بھی نہ ہوتا ستم بھی نہ ہوتا ، کرم بھی نہ ہوتا
سکوں دل کو ملتا نہ رنج و الم سے نہ رنج و الم ہوتا لطف و کرم سے
نہ ہوتی طبیعت ترحّم پہ مائل نہ دل ہوتا ضرب تغافل سے گھائل
نہ ہوتا کوئی دل سے شیدا کسی پر نہ اسرارِ الفت ہویدا کسی پر
''پپیہا'' نہ ''پی'' کے لیے کوُک کرتا نہ ''کبک دری'' چاند پر جاں چھڑکتا
نہ مرتا کوئی پیار کی راگنی پر نہ مٹتا کوئی کرشن کی بانسری پر
نہ شیریں کا غم کوہکن کو ستاتا نہ وامق کبھی نازِ عذرا اٹھاتا
نہ مجنوں پہ ہوتی فدا کوئی لیلا درِ ہیر پر سر جھکاتا نہ رانجھا
نہ پرکیف ہوتی کسی کی جوانی نہ دل دوز ہوتی وفا کی کہانی
نہ کلیاں چٹکتیں ، نہ بلبل چہکتا !! نہ فرطِ طرب سے گلستاں دمکتا
نہ ہوتی فضائے چمن روح پرور مشام دل و جاں نہ ہوتے معطّر
شب ماہ ہوتی نہ صبحِ بہاراں نہ رشکِ جناں ہوتی بزمِ نگاراں
نہ لگتی کبھی بزم ساقی سہانی نہ سیراب کرتی مئے ارغوانی
نہ شاعر محبت کا لکھتا ترانہ نہ رنگین ہوتا جنوں کا فسانہ
نہ اہل نظر گیت عرفاں کے گاتے نہ اصحابِ دل ، دل کی دنیا بساتے
نہ جلتا دیا دانش و آگہی کا نہ ہوتا دبستاں کہیں شاعری کا
محبت نہ ہوتی تو ہوتے نہ ہم تم حجابوں میں ہوتا خدائے جہاں گم

صفحات ۶۵۰ قیمت =/۳۰۰ روپے

مطبوعات جدیدہ

بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں : از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ

جہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۰۷، قیمت: ۱۹۵ روپے،

پتہ: قندیل-لاہور، پاکستان۔

اس ضخیم کتاب کے مصنف تاریخ ہند و پاکستان کے مختلف اور اہم موضوعات پر قابل قدر کتابوں اور مضامین ومقالات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، کثیر التصانیف ہیں اور خوبی یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کی اہمیت کے باوجود، ان کے بارے میں واقفیت کم رہی اور مرور زمانہ کے ساتھ یہ اور بھی کم ہوتی جاتی ہے، زیرنظر کتاب میں بھی انہوں نے اپنی ان چند تحریروں کو جمع کیا ہے جو انہوں نے برسوں پہلے کراچی کے گورنمنٹ نیشنل کالج کے مجلّہ علم وآگہی کے ایک خاص نمبر کے لیے سپرد قلم کی تھیں، خدام کعبہ، ریشمی رومال، ہجرت اور خلافت و ترک موالات جیسی ملی وقومی تحریکوں کی اہمیت، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور اس کے بعد برصغیر کی قومی وملی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے سمجھتے ہیں لیکن نئی نسل کو کیا معلوم کہ خدام کعبہ اور ہجرت کی تحریکیں کیسے برپا ہوئیں، جب کہ ہمت وعزیمت کی یہ داستانیں اس لائق ہیں کہ بار باران کے مطالعہ سے اکتساب فیض کیا جائے، سیاست کو جاننے کے لیے تاریخ سیاست کا مطالعہ ناگزیر ہے، فاضل مصنف کو اسی باب میں اختصاص حاصل ہے اور اس کا اندازہ ان کے فاضلانہ مقدمے سے ہوتا ہے کہ قومی اور ملی ادارے کی معنویت ان کے نزدیک کتنی وسیع ہے جس میں مسلم، غیر مسلم، قومی، فرقہ واری، مذہبی، سیاسی، تعلیمی، اصلاحی تمام شعبے آجاتے ہیں، قریب تیس پینتیس سال پہلے انہوں نے مجلّہ علم وآگہی کے لیے یہ مواد فراہم کیا تو بعض اجزاء کالج کے ذمہ داروں کے نزدیک اشاعت کے لیے موزوں ومناسب نہیں ٹھہرے، اس کتاب میں ان کو بھی شامل کردیا گیا ہے، تحریک خدام کعبہ کے قیام میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا شوکت علی جیسے مشاہیر کا خیال و

عزم شامل تھا، ۱۹۱۳ء میں جب اس تحریک نے غرض و غایت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ ''اس انجمن کی اصل غرض حرم محترم کی ہر قسم کی خدمات بجا لانا اور اس کو غیر مسلم ہاتھوں سے محفوظ رکھنا ہے'' تو استعماری انگریز حکومت کا چیں بجبیں ہونا فطری امر تھا کہ اس کے ناپاک استعماری ارادوں میں حرم محترم کی بے حرمتی بھی شامل تھی، ظاہر ہے اس صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کے غم و غصہ کا نشانہ انگریز حکومت ہی ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بات دار و رسن تک پہنچی اور اور تحریکوں کی طرح اس کو بھی ناکامی ہاتھ لگی، فاضل مصنف نے ناکامی اور اس کے اسباب کا بھی متوازن جائزہ لیا جو آج بھی اس راہ میں عبرت و ہدایت کا کام دے سکتا ہے، بقیہ تینوں تحریکوں کے بارے میں بھی مطالعہ و تجزیہ کا یہی انداز ہے، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بحث کے سلسلے میں جو کچھ بھی دستیاب ہوا اور یہ ''جو کچھ'' یقیناً نوادر میں ہے وہ سب سلیقے سے پیش کر دیا گیا ہے، تحریک خلافت اور ترک موالات کا بیان سب سے مفصل ہے اور کہنا چاہیے کہ تحریک خلافت پر یہ بنیادی اور مستند معلومات کا بیش قیمت ماخذ ہے، اس میں واقعی کچھ نازک مقام بھی آ گئے ہیں لیکن اس رائے کی صداقت سے کون صرف نظر کر سکتا ہے کہ ''علمائے کرام کے سامنے بے قید اتحاد کبھی مقصد نہیں رہا، انہوں نے ایسے ہندو مسلم اتحاد کی کبھی تائید نہیں کی جو دونوں قوموں کو ایک ایسی متحدہ قومیت میں تبدیل کر دے جہاں مسلمان اپنے تمام تہذیبی اور اسلامی خصائص سے عاری ہو جائیں'' یہ کتاب واقعی مسلمانان برصغیر ہند کی قومی و ملی تاریخ کے ایک اہم حصہ کی ایک بہترین دستاویز ہے۔

اقبال درون خانہ: از جناب خالد نظیر صوفی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۴۲، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶- میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب، اقبالیات کے وسیع ذخیرے میں انفرادیت رکھتی ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے کلام، پیام، فکر و فلسفہ اور قلب و ذہن کے درون و دریچوں کی جگہ اصل اقبال کو بحیثیت انسان دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، علامہ مرحوم کی بہن کے دل و دماغ پر نقش ان یادوں کے اجالے ان کے صاحب زادے اور علامہ کے برادر اکبر کے نواسے نے بڑی خوب صورتی سے بکھیر دیے ہیں، اندرون خانہ کی یہ گواہی، سادگی اور سچائی کے ساتھ ہے اس

لیے اس میں اثر بھی زیادہ ہے، یادداشتوں کا یہ مجموعہ برسوں پہلے چھپا، زیرنظر کتاب، طبع سوم ہے اس لیے یہ جدید ترین ہے اور کچھ اضافوں کے ساتھ ہے، علامہ کے بچپن سے دم واپسیں تک عمر کے ہر مرحلے کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ علامہ کی اصل زندگی کا جیتا جاگتا مرقع نظر کے سامنے آجاتا ہے، مولانا غلام رسول مہر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اقبالیات کے باب میں اس وضع وانداز کی شاید ہی کوئی اور کتاب مرتب ہوئی ہو، باتوں باتوں میں ذاتی حالات وصفات کے ساتھ کچھ نئی باتیں شاعر اقبال کے محققین کے لیے بھی آگئی ہیں، مثلاً ان کی مشہور نظم، بچہ اور شمع کا محرک کیا ہے؟ علامہ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اس کتاب کی گواہی بھی مستند ترین ہے، چند ضمیمے بھی ہیں ایک میں علامہ اقبال کے متعلق بعض نادان نکتہ چینیوں کے ہفوات کا جائزہ ہے، یہ ضروری ہے کہ اقبال کے درون خانہ میں جھانک کر لوگوں نے اپنی کج نظری کو تحقیق کا نام دے کر تحقیق کو رسوا کیا، فاضل مرتب نے صحیح لکھا کہ الزامات تراشنے اور پھیلانے میں ایک ''بین الاقوامی فرقہ'' کے افراد کا ذہن کارفرما ہے، یہ فرقہ روز اول سے راندۂ درگاہ ہے اور اب تو اس کا مغضوب علیہ وضال ہونا متفق علیہ حقیقت ہے، یہ مختصر کتاب واقعی چراغ رہ گزر نہیں، چراغ بام و در کی روشنی سے منور ہے، اس لیے درون خانہ ہنگاموں کی اس سے صحیح خبر اور کہاں ملتی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات: از ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۴، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵ - اور دہلی، ممبئی، کولکاتہ، لکھنؤ، پٹنہ، احمد آباد، حیدرآباد، جے پور، چنئی، علی گڑھ، الہ آباد کے مشہور مکتبے۔

مولانا قاسم نانوتوی واقعی اسم با مسمیٰ تھے کہ وہ قاسم العلوم والخیرات تھے، شمشیر و قلم، عزم وعلم کے ایسے امتزاج کی مثالیں بہت کم ہیں، دارالعلوم دیوبند کے بانی اور جہاد آزادی کے ایک غازی کی حیثیت سے ان کا ذکر شایان شان الفاظ میں ہوتا رہتا ہے لیکن از ہر ہند کے عظیم بانی کے تعلیمی نظریات پر عموماً اظہار خیال کم کیا گیا، یہ کتاب اسی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی اور چونکہ لائق مصنف کی شناخت ایک معلم اور تعلیمات کے ایک متخصص کی ہے اس لیے ان کو اس کا حق بھی تھا اور خوشی ہے کہ انہوں نے ایک حد تک یہ ذمہ داری ادا بھی کی، ایک حد تک اس لیے کہ

کتاب کے پانچ ابواب میں پہلے چار میں حیات وشخصیت، تصانیف، عہد و ماحول اور تحریک دیوبند جیسے عناوین کے تحت گفتگو کی گئی ہے، آخری باب میں تعلیمی تصورات پیش کیے گئے ہیں اور درحقیقت ان کی بنیاد صرف قرآن وسنت کا فروغ ہے کہ انسانی معاشرے کی فوز وفلاح صرف اسی نظام تعلیم سے ممکن ہے جس کی اساس کوقرآن وسنت سے مستحکم کیا جائے۔

LET US SPEAK COLLOQUIAL ARABIC العربیۃ لفصحی والعامیۃ : از محمود حافظ عبدالرب مرزا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰، قیمت: ۴۵۰ روپے، پتہ: اکیڈمک اکسیلنس، پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، ۴۲-۱ یکتا اپارٹمنٹ، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱۔

فصیح زبان اور عام یا عوامی بولی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اس کی دلچسپ کہانی اس کتاب کی زبانی بیان کی گئی ہے، ہندوستان میں عربی کی فصاحت، بلاغت، صرف ونحو اور زبان کے اور قواعد سے خاصی واقفیت کے باوجود اگر سابقہ عرب کے بازاروں، دفتروں اور گھروں سے ہوجائے تو کیسی دشواریاں پیش آسکتی ہیں، غالباً اسی مقصد سے لائق اور ہونہار مصنف نے یہ کتاب مرتب کردی، ان کی چھوٹی سی عمر کا بڑا حصہ سعودی عرب میں گزرا ہے، اب وہ جواہر لال یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کررہے ہیں، طالب علمی میں تصنیف وتالیف کا جذبہ اور عمل بجائے خود قابل قدر ہے، کتاب ظاہر ہے روزمرہ بول چال کے جملوں پر مشتمل ہے لیکن مصنف نے سلیقے سے تین حصوں میں ان کو اس طرح تقسیم کیا ہے کہ پہلے حصے میں ٹیلی فونی گفتگو سے ہوٹل، کلینک، پوسٹ آفس، بینک، ٹیکسی ڈرائیور، ریلوے اسٹیشن، ایرپورٹ وغیرہ مقامات پر حرف مطلب کی ادائیگی، دوسرے حصے میں اشیاء کے اسماء اور تیسرے حصے میں چند خاص مفید الفاظ اور جملے اور محاورے اور ضرب الامثال دیے گئے ہیں، یہ مطالعہ بہت دلچسپ ہے، اراک فیما بعد (پھر ملیں گے) کے لیے اشوفک بعدین، لماذا المحلات مغلقة الیوم (آج دکانیں بند کیوں ہیں) کے لیے لش الدکاکین صاکة الیوم، هذا القلم لی ام لک (قلم میرا ہے یا تمہارا) کے لیے هذا القلم حقی ولا حقک سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، مصنف نے عربی فصحی اور عامیہ کی تفریق کے ساتھ تلفظ اور معانی کا اہتمام انگریزی میں بھی کیا ہے جس سے اس

کتاب کی افادیت ان لوگوں کے لیے خاص طور پر دو چند ہوگئی ہے جو صرف عربی یا انگریزی جانتے ہیں اور عالم عرب میں وقت گزارنا چاہتے ہیں، البتہ کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

حرمین (نعتیہ مجموعہ): از جناب رہبر تابانی دریابادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: رہبر تابانی، محلّہ چھیپی، دریاباد، ضلع بارہ بنکی ۲۲۵۴۰۳۔

اس پرکیف نعتیہ مجموعہ کلام کے شاعر کے دوسرے غزلیہ اور نظمیہ مجموعے "آبلے اور آبگینے" تھے، ان کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، آبلے سے آبگینے تک کا سفر ان کی شاعری کی سمت خود ہی متعین کردیتا ہے، ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مضمون کے انتخاب واظہار میں پاکیزگی، شائستگی اور معصومیت ومتانت کے عناصر ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے، ان کا تعلق شفیق جون پوری کے سلسلۂ شعری سے ہے، جس کے اوصاف یعنی برجستگی، روانی، زبان کی صفائی اور فنی وعروضی پختگی جناب رہبر کو ورثے میں ملے، آبلے جب آبگینوں میں بدل جائیں تو یہ گویا گوہر مراد کے حصول کی خوش خبری ہے، ہوا بھی یہی کہ تیسرا مجموعہ حرمین کی مبارک شکل میں آیا، عمدہ شاعری کی معراج حمد ونعت گوئی ہے کہ فکر وفن کو بقا ودوام اسی سے ہے۔

حسن تفسیر سورۂ اخلاص مظہر لا الٰہ کیا کہیے
ان کے جلوے بقدر ظرف نظر تا بہ حد نگاہ کیا کہیے

ظرف نظر کا یہ پیمانہ خوش نصیبوں کو ہی حاصل ہوتا ہے، تب زباں یہی اعتراف کرتی ہے کہ

وجہ تخلیق دو عالم ہے تیری شخصیت ذہن انساں نہیں کرسکتا احاطہ تیرا

اس قسم کے اشعار سے یہ مجموعہ چمن زار رسول ﷺ نظر آتا ہے، جہاں بقول تسنیم فاروقی "دماغی ادب ترتیب نہیں پاسکتا، محض ان ہی راستوں کا چراغاں راس آتا ہے جن کی کہکشاؤں سے ہوکر آقائے نام دار ﷺ نے دنیائے انسانیت کو سکون بخشا"، رہبر تابانی کے لیے یہ شہادت ہم بھی دے سکتے ہیں کہ ان کے خمیر وضمیر میں چمک، دین واخلاق کے اجالوں سے ہے، حرمین اس کا ثبوت ہے۔

ع۔ص